کلیاتِ اختر الایمان



ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

کلیاتِ اخترالایمان

مرتبہ

سلطانہ ایمان

بیدار بخت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

KULLIYAT-E-AKHTAR-UL-IMAN

EDITED BY

BAIDAR BAKHT
&
SULTANA IMAN

YEAR OF EDITION. 2000

ISBN- 81-86232-99-0

Price. Rs. 350/-

نام کتاب..............................کلیاتِ اختر الایمان

مرتبہ..............................بیدار بخت و سلطانہ ایمان

سنِ اشاعت..............................سنہ ۲۰۰۰ء

قیمت..............................۳۵۰ روپے

مطبع
....

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi - 6 (INDIA)
Phone: 321 6162, 321 4465. Fax: (011) 326 5278

فہرست

فصل ۱، گرداب (اشاعت: ۱۹۴۳)

فصل ۲، سب رنگ (سالِ تصنیف: ۱۹۴۳)

فصل ۳، گرداب کے بعد کی ایک نظم (۱۹۴۸)

فصل ۴، تاریک سیارہ (اشاعت: ۱۹۵۲)

فصل ۵، آب جو (اشاعت: ۱۹۵۹)

یادیں (اشاعت: ۱۹۶۱)

فصل ۶، بنتِ لمحات (اشاعت: ۱۹۶۹)

فصل ۷، نیا آہنگ (اشاعت: ۱۹۷۷)

فصل ۸، سر و ساماں (اشاعت: ۱۹۸۳)

فصل ۹، زمین زمین (اشاعت: ۱۹۹۰)

فصل ۱۰، زمستاں سرد مہری کا (اشاعت: ۱۹۹۷)

پیش لفظ

سلطانہ ایمان

کچھ دن پہلے میں اخترالایمان کے کاغذات دیکھ رہی تھی کہ میری نظر ایک پیڈ پر لکھی ہوئی تحریر پر پڑی۔ چھوٹا سا جملہ تھا جو اخترالایمان نے اپنے بارے میں لکھا تھا: 'اخترالایمان ایک واقعہ ہے جو خود بخود وجود میں آ گیا اجتماعی اور انفرادی شعور کے ساتھ'۔

یہ واقعہ جب وجود میں آیا میں انھیں نہیں جانتی تھی، البتہ جب میں ان سے ملی اور شادی ہوئی تو وہ باشعور انسان تھے۔ شعور کی شدت انھیں مسلسل بے چین رکھتی تھی اور اسی بے چینی کے عالم میں وہ نظم لکھتے تھے۔ نظم کہہ چکنے کے بعد بے چینی قدرے خوشی میں تبدیل ہو جاتی تھی، مگر بہت قلیل عرصے کے لیے، یعنی جب تک دوسری نظم نہ ہو۔ اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ میرے خیال میں شعور اور شدتِ احساس ہی اخترالایمان کی شاعری ہے۔

شادی کے بعد مجھے ان کی چند عجیب عادتوں کا پتہ چلا۔ رات گئے کبھی میری آنکھ کھل جاتی تو برابر کے پلنگ پر ان کو نہ پا کر پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ پھر ایک دن اٹھ کر دیکھا، باہر کے کمرے میں بیٹھے نظم لکھ رہے تھے۔ میں دبے قدموں ان کے پاس گئی اور آہستہ سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک گئے اور لکھنا بند کر دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے انھیں ڈسٹرب کر دیا، چنانچہ واپس اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ صبح کو انھوں نے اپنی نظم مکمل کرنے کو پنسل مانگی۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی پنسلوں میں سے ایک اٹھا کر دے دی، مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے کہا رات والی پنسل تلاش کر کے دوں جو کہیں ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ جس پنسل سے نظم شروع کی تھی، صرف اسی سے ختم ہو سکتی تھی۔

طالب علمی کے زمانے میں اخترالایمان سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہونٹوں میں سگریٹ نہ دبی ہو اور اس کا دھواں آنکھوں میں نہ جاتا رہے نظم نہیں

کہہ سکیں گے۔ ان ساری عادتوں کے ساتھ ان میں ایک بہت اچھی عادت تھی کہ جب انھیں احساس ہونے لگتا کہ کسی چیز کے عادی ہو رہے ہیں تو اسے چھوڑنے کی شعوری کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھیں احساس ہونے لگا کہ شاعری ٹونکوں سے نہیں، دل و دماغ اور احساس سے کی جاتی ہے تو انھوں نے وہ عادتیں چھوڑ دیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ سگریٹ چھوڑ دی، اور پنسل کی جگہ فاؤنٹن پین نے لے لی۔ مجھے بھی پنسل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سنبھال کر رکھنے کی پریشانی سے نجات مل گئی۔

ہماری زندگی اور بہت لوگوں کی طرح اچھے برے سب مقامات سے گزری۔ کبھی یہ پریشانی تھی کہ اگلے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا۔ کبھی ایسی آسودگی بھی آئی کہ چیز خریدتے وقت یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ مہنگی ہے یا سستی۔ کبھی اخترالایمان کی صحت قابلِ رشک تھی تو کبھی ہفتوں اسپتال میں رہے۔ مگر ان سب حالات میں ایک چیز مشترک تھی، وہ ان کی شاعری۔ حالات کیسے بھی ہوں مگر اخترالایمان نے شاعری کبھی نہیں چھوڑی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ان کے زندہ رہنے کا مقصد صرف شاعری تھا۔

اخترالایمان دوسرے شاعروں کی طرح شعر کہہ کر سنانے کے لیے بے چین نہیں ہوتے تھے، مگر انھیں اس بات خیال ضرور رہا کہ ان کی تخلیق کتابی شکل میں دستیاب رہے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے ۱۹۶۱ میں خود اپنا اشاعتی ادارہ، رخشندہ کتاب گھر، قائم کیا جس نے ان کے شعری مجموعے 'یادیں'، 'بنت لمحات'، 'نیا آہنگ'، 'سروساماں' اور 'زمین زمین' شائع کیے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اشاعتی ادارے کا مقصد کاروباری نہیں تھا۔ میرے خیال سے اس کا محرک ایک فرض کا احساس سا تھا کہ ان کی کتابیں چھپتی رہیں اور سلیقے سے چھپیں۔ ایسے ہی فرض کے احساس نے ان سے میراجی کا مجموعہ 'سہ آتشہ' چھپوایا جس کی سینکڑوں کاپیاں آج بھی میری الماریوں میں بھری پڑی ہیں۔ کاش کوئی ادب شناس میری الماریاں خالی کرادے۔

وفات سے ایک دو سال پہلے انھوں نے مجھ سے اور بیدار بخت سے خواہش ظاہر کی کہ ایسا ٹرسٹ قائم کیا جائے، جو ان کی کتابیں چھاپتا رہے۔ بیدار سے کہا کہ 'چھاپنے کا بندوبست تم کرنا، میری لڑکیاں اور لڑکا مل کر چھاپنے کے پیسے دیں گے۔' بوجوہ ٹرسٹ تو قائم نہ ہو سکا، مگر خدا کا شکر ہے کہ اخترالایمان کی کتابیں برابر چھپ رہی ہیں۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مجتبیٰ خان سے اخترالایمان کو ایک تعلق خاطر تھا۔ جب

انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی کلیات چھاپنا چاہتے ہیں تو ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ اس کتاب میں اخترالایمان کا وہ سب کلام شامل ہے جو انھوں نے خود اپنے نو مجموعوں میں شامل کیا تھا، اور وہ بھی جو ان کے آخری اور پس مرگ مجموعے میں شامل ہے۔ ان کا وہ کلام اور افسانے جو رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان کتابوں میں نہیں ہے، 'باقیات اخترالایمان' کے عنوان سے ایک کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں جو محمد فیروز دہلوی مرتب کر رہے ہیں۔ اس کتاب کو بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس چھاپے گا۔

اخترالایمان اپنی پرانی نظموں میں بھی رد وبدل کرتے رہتے تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ 'کلیات اخترالایمان' میں نظمیں اپنی آخری شکل میں پیش کی جائیں۔ اس کتاب کی تقریباً آدھی نظمیں مجتبی خانصاب نے ٹائپ سیٹ کرائی ہیں، اور باقی بیدار بخت نے اپنے کمپیوٹر پر کی ہیں۔ پورے مسودے کو کئی بار پڑھا گیا ہے۔ اگر ہماری احتیاط کے باوجود کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

مشہور زمانہ مصور جناب مقبول فدا حسین نے از راہ کرم اپنے ہم عصر، اخترالایمان، کے آخری مجموعے (’زمستاں سرد مہری کا‘) کے گرد پوش کے لیے ایک نہایت خوبصورت تصویر بنائی تھی۔ اسی تصویر کو ہم نے کلیات کے گرد پوش کے لیے بھی چنا ہے۔ غور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ یہ تصویر نہ صرف اخترالایمان کی نظم 'لڑکا' کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ان کی نظموں کی طرح علامتی بھی ہے۔ مثلاً تصویر میں سرخ رنگ، خون کے رنگ کی مناسبت سے، ہمیں زندگی کی علامت دکھائی دیتا ہے، اور سیاہ ٹکڑا ہمارے قلب کی سیاہی کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے جس کی نفی ہمارا ضمیر کرتا رہتا ہے۔

سلطانہ ایمان

۱۳ اگست ۱۹۹۹

اخترالایمان کے دیباچوں اور سوانح عمری کے اقتباسات، جن سے ان کی شاعری پر روشنی پڑتی ہے

آب جو، اشاعت ۱۹۵۹

کتاب (گرداب) کے شائع ہونے کے بعد احباب کے ایک حلقے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ گرداب کی شاعری قنوطی، یاس انگیز اور گھٹن لیے ہوئے ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ شاعری کی طرف ہمارے پڑھنے والوں کا رویہ سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ شاعری کو تفننِ طبع اور ایک ایسے مشغلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس کا مقصد صرف وقت گزرانی ہے۔ احباب کا یہ حلقہ بجائے اپنے دماغوں پر زور ڈالنے کے لکھنے والوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جو ان کی ذہن کی سطح سے بلند نہ ہو اور سنتے ہی سمجھ میں آ جائے۔ کسی بھی ادب کی طرف یہ روّیہ منفی ہے، اس لیے کہ یہ احباب غیر ارادی اور نادانستہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ ادب میں نئے موضوعات کا اضافہ نہ کیا جائے، نہ کسی نئی بات پر قلم اٹھایا جائے، کسی قسم کے فکری عناصر کو رواج نہ دیا جائے اور ہیت اور تکنیک کا کوئی تجربہ نہ کیا جائے۔

گرداب کی جن نظموں سے زیادہ غلط فہمی ہوئی وہ 'مسجد'، 'موت'، 'قلوبطرہ'، 'پگڈنڈی'، 'تنہائی میں' وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان نظموں کی تشریح کے سلسلے میں بہت تفصیل سے نہیں جاؤں گا، البتہ چند اشارے کیے دیتا ہوں جن سے ان نظموں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ساتھ ہی شاید یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے یہ نظمیں قنوطی ہیں۔ نظم 'مسجد' جس بند پر ختم ہوتی ہے وہ یہ ہے:

تیز ندی کی ہر موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی!
کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی!

اور نظم 'موت' ان اشعار پر ختم ہوتی ہے:

اُف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت
کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

ان دونوں نظموں کا ماحول مغموم، گھٹا ہوا اور مَوت سے پُر محسوس ہوتا ہے۔ محسوس ہی نہیں ہوتا، ہے بھی۔ یہ دونوں نظمیں ایسی ہیں جن کے اگر علامیہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو سیدھی بھی ہیں۔ 'مسجد' ایک ویران مسجد کا خاکہ ہے، اور 'مَوت' ایک چھوٹا سا منظوم ڈرامہ ہے جس میں تین کردار ہیں (۱) مرد، (۲) عورت، اور (۳) دستک۔ مرد بیمار ہے، بستر مرگ پر ہے اور نزع کے عالم میں ہے۔ عورت، اس کی محبوبہ ہے اور مرد کے ذہن کو مَوت کے اس خیال سے باز رکھنا چاہتی ہے جو اس پر حاوی اور مسلّط ہو گیا ہے، اور دستک ایک ایسی آواز ہے جو مسلسل دروازے پر سنائی دے رہی ہے۔ ان نظموں کے جس ماحول اور فضا نے سرسری پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ یہ نظمیں قنوطی ہیں وہی دراصل ان کا حُسن ہے۔ اس لیے کہ میرا مقصد نہ کسی ویران مسجد کا خاکہ کھینچنا تھا اور نہ کسی دَم توڑتے ہوئے آدمی کی کہانی لکھنا تھا۔ یہ دونوں نظمیں علامتی ہیں، جن کا رواج ہماری شاعری میں اٹھارہ سال پہلے بھی نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔

مسجد مذہب کا علامیہ ہے اور اس کی ویرانی عام آدمی کی مذہب سے دوری کا مظاہرہ ہے۔ رعشہ زدہ ہاتھ مذہبیت کے آخری نمائندہ ہیں اور وہ ندی جو مسجد کے قریب سے گزرتی ہے وقت کا دھارا ہے جو عدم کو وجود اور وجود کو عدم میں تبدیل کرتا ہے اور اپنے ساتھ ہر اس چیز کو بہا کر لے جاتا ہے جس کی زندگی کو ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح 'مَوت' میں بھی جو آدمی بستر مرگ پر ہے وہ ان پرانی قدروں کا علامیہ ہے جو اب مر رہی ہیں۔ محبوبہ جھوٹی تسلّیاں ہے اور مسلسل دستک وقت کی وہ آواز ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی۔ ہمیشہ زندگی کے دروازے کو کھٹکھٹاتی رہتی ہے اور مکین اگر اس آواز کو نہیں سنتا تو وہ اس مکان کو توڑ ڈالتی ہے اور اس کی جگہ نیا مکان تعمیر کر ڈالتی ہے۔ وہ احباب جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اگر ان نظموں کے اس علامیہ کو سمجھ لیتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے تو اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے

جس کا ہوئے ہیں۔ گرداب کی نظموں میں 'تنہائی میں' بھی اتنی اہم ہے جتنی یہ نظمیں جن کی تشریح ابھی کی گئی ہے، مگر چونکہ یہ اپنی ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے مشکل نہیں اس لیے میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ 'ببول' اور 'تالاب' یونہی استعمال نہیں کیے گئے۔ انھیں جہاں بار بار دہرا کر ڈرامائی تاثر کو ابھارا گیا ہے وہاں علامیہ کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ 'ببول' بے برگ و بار زندگی کا علامیہ ہے اور 'تالاب' اس سرمایہ کا جو تالاب کے پانی کی طرح ایک جگہ اکٹھا ہو کر رہ گیا ہے، جس میں پانی باہر سے آ کر ملتا تو ہے مگر باہر نہیں جا سکتا، اور ایک جگہ پڑے پڑے سڑنے لگا ہے۔ اور اس میں ایسے جانور پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے انسانی سماج کو چکلے اور جنسی بیماریاں دی ہیں۔ اس نظم کے یہ دو بند:

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلتا ہو دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

یا کہیں گوشۂ اہرام کے سناٹے میں
جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں
ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کس کو پوجوں

ایسے ہی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

گرداب کی دوسری نظموں میں 'جواری' اور 'پگڈنڈی'[ا] کا علامیہ صاف ہے۔ البتہ ایک نظم اور ہے، میں جس کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا اور وہ ہے 'قلوبطرہ'۔ اس نظم کا پس منظر دوسری جنگِ عظیم ہے اور اس کا مرکزی تخیل وہ کجی ہے جو جنگ کے سبب وجود میں آتی ہے اور جس کا

شکار عام طور پر دوغلی نسل کی وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو نسلی اعتبار سے نفسیاتی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہوتی ہیں اور اپنے آپ کو اپنے دوسرے ہم وطنوں سے برتر اور مختلف سمجھتی ہیں:

شام کے دامن میں پیچاں نیم افرنگی حسیں
نقرئی پاروں میں اک سونے کی لاگ
رہ گذر میں یا خراماں سرد آگ
یا کسی مطرب کی لے، اک تشنہ تکمیل راگ

عشرتِ پرویز میں کیا نالہ ہائے تیز تیز
اڑ گیا دن کی جوانی کا خمار
شام کے چہرے پہ لوٹ آیا نکھار
ہو چکے ہیں، ہو رہے ہیں اور دامن داغدار

یہاں تک تو تھا اس کتاب کے پہلے حصے کے بارے میں۔ اب رہ جاتا ہے دوسرا حصہ: اس کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس حصے کی نظمیں 'گرداب' کے اٹھارہ سال بعد کی نظمیں ہیں۔ اس لیے انہیں سمجھنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت ہے۔ کاوش سے میری یہ مراد نہیں کہ یہ نظمیں آپ

[۱] اخترالایمان کے ایک افسانے، پگڈنڈی، کے یہ اقتباسات شاید اس نظم کے محرک پر روشنی ڈال سکیں۔ یہ افسانہ ۱۹۴۲ میں، غالباً نظم کی تصنیف سے پہلے، شائع ہوا تھا۔

'پگڈنڈیاں لجاتی، ان دیکھی وادیوں سے کتراتی چلی جاتی ہیں، دور بہت دور تک اور بڑھتے بڑھتے آسمان سے جا ملتی ہیں۔ چلنے والے ان پگڈنڈیوں اور آسمان کے درمیان کہیں کھو جاتے ہیں، اس طرح کہ نقشِ قدم بھی نہیں چھوڑتے۔

'آدمی کا جسم بھی ایک پگڈنڈی ہے جس پر سے مختلف دور گزر جاتے ہیں۔۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا اور جھرّیوں کی شکل میں اپنا راستہ چہرے پر چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ سب کھو جاتے ہیں، اس زمین اور آسمان کے درمیانی خلا میں، ہوا کے ایک لطیف کرہ میں۔'

کے ذہن کی رسائی سے باہر ہیں یا آپ کے فکری معیار سے بلند ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ احباب جو اس شاعری کو پھر رواداری میں پڑھنا چاہتے ہیں اور اس سے وہ لطف لینا چاہتے ہیں جو قوالی یا سوز خوانی سے میّسر آتا ہے تو، مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ، یہ شاعری ان کی اس خواہش کو پورا نہیں کر سکے گی۔ میرے اس بیان سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ میں اپنی شاعری کو وحی یا عجائبِ روزگار کا درجہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ میرا خونِ جگر ہے، اس پر کوئی ایسا حکم نہ لگایئے جو آپ کی غیر ذمہ داری پر دلالت کرتا ہو۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اسے ایک، دو، تین بار پڑھیے۔ اپنے آپ کو غزل کی فضا سے نکال کر پڑھیے۔ یہ سوچ کر پڑھیے کہ یہ شاعری مشین میں نہیں ڈھلی۔ ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو دن رات بدلتی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہوتا ہے۔ جو اس معاشرے اور سماج میں زندہ ہے جسے آئیڈیل نہیں کہا جاسکتا۔ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہے، تضاد ہے۔ جہاں انسان کا ضمیر اس لیے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا کہ زندگی ایک سمجھوتے کا نام ہے اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں، مصلحت ہے۔ اور ضمیر کو چھوڑا اس لیے نہیں جا سکتا ہے کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو ہر اعلیٰ قدر کی نفی ہو جائے گی۔ نظم 'ایک لڑکا' اور یادیں کا یہ بند:

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

ایسی ہی کشمکش اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ کا نتیجہ ہیں۔

یادیں، اشاعت ۱۹۶۱

شاعری میرے نزدیک کیا ہے۔ اگر میں اس بات کو ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو مذہب کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جسے انسان دیانتداری سے کرنا چاہے، اس میں جب تک وہ لگن اور تقدس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے، اس کام کے اچھا ہونے میں ہمیشہ شبہ کی گنجائش رہے گی۔ یہ شاعری جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں وہ لگن اور تقدس ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں میں نے شاعری کو اپنا ایمان اور مذہب سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے آج تک زندگی اور اس کے نشیب و فراز کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کیا جو میری شاعری کو مجروح کرتا ہو۔

اپنی شاعری سے متعلق ایک اور اہم بات یہ کہوں گا۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس وقت نہیں لکھا جب ان تجربات اور محسوسات کی منزل سے گزر رہا تھا۔ انہیں اس وقت قلمبند کیا ہے جب وہ تجربات اور محسوسات یادیں بن گئے تھے۔ جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ ہر طوفان گزر کر سطح ہموار ہو گئی تھی اور ہر رفتہ اور گذشتہ تجربے کی صدائے بازگشت مجھے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے میں ان سے وابستہ بھی ہوں اور نہیں بھی۔ یہی وجہ ہے میری بیشتر شاعری میں ایک یاد کا سا رنگ ہے اور یہ شاعری بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی:

دور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اس کے پیچھے سے جھجکتا ہوا اک گول سا چاند
اُبھرا بے نور شعاعوں کے سفینے کو لیے
(تنہائی میں)

ان صفحات میں میری کم و بیش تیس برس کی شاعری ہے، اس شاعری کا محرک اشفاق نام کا ایک آدمی تھا، جس کے سر اور داڑھی کے بال سرخ تھے۔ رنگ بہت گورا تھا۔ آواز جھوجری تھی اور دلّی کے گلی کوچوں میں اپنی شاعری گا گا کر چار چھے صفحات کی کتاب کی شکل میں بیچا کرتا تھا۔ 'ایسا شعر تو میں بھی کہہ سکتا ہوں'۔ یہ خیال ایک بار میرے دِل میں گزرا اور میں نے غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ ان دنوں میں دلّی کے ایک یتیم خانے موید الاسلام میں رہتا تھا اور چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

۱۹۳۴ میں میری یتیم خانے کی زندگی ختم ہو گئی۔ تعلیم جاری رکھنے کے لیے میں نے فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا اور غزل کو ترک کر کے اکا دکا نظم کہنی شروع کر دی۔ کیوں؟ اس کا محرک اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔ غالبًا کوئی محرک تھا ہی نہیں۔ ان دنوں جتنی نظمیں کہیں ان میں سے مجھے صرف ایک کا عنوان یاد ہے: 'گورِ غریباں'، جو اسکول میگزین میں چھپی تھی۔

اسکول کا زمانہ ختم ہونے کے بعد میں اینگلو عربک کالج چلا گیا اور کچھ مدّت شعر کہنے کے بعد شاعری ترک کر دی۔ اور اس کی جگہ افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ یہ افسانے ساقی، ادبِ لطیف، اور نیا ادب وغیرہ میں چھپتے رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب افسانوں سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ شعر کہنا اس لیے ترک کیا تھا، وہ شاعری بے رس، بے نمک اور فرضی محسوس ہوئی تھی۔ افسانے لکھنے اس لیے چھوڑ دیے کہ وہ بہت معمولی معلوم ہوئے۔

ایک مدّت گزر گئی، لکھنا لکھانا ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ پڑھنے کی طرف توجہ دی مگر کبھی کبھی بڑی الجھن ہوتی تھی۔ ایک خلش کا احساس۔ جی کچھ کرنے کو چاہتا تھا، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کیا جائے۔ لکھنے لکھانے اور شعر گوئی کے سلسلہ میں مشورہ کبھی کسی سے کیا نہیں تھا۔ وحشت اس درجہ بڑھی سر منڈوا دیا۔ جب پڑھنے سے جی اچاٹ ہوتا ورزش کرتا۔ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا، میلوں ننگے پاؤں گھاس پر دوڑتا، کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر خطابت کی مشق کرتا، اور دن بھر اور رات بھر دلّی کی سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا۔ پھر ایک دن ایک نظم کہی۔ عنوان تھا: 'نقشِ پا'۔ اس نظم کا محرک تھے فیروز شاہ کے کوٹلے کے کھنڈر:

یہ نیم خواب گھاس پر اداس اداس نقشِ پا
کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں ہوا میں جذب ہو گئیں
جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ نظم میری موجودہ شاعری کا آغاز تھی۔ یہ زمانہ دِلّی میں

پہنچے جو رات خواب میں ان کے مکان پر
سوئے زمیں پہ آنکھ کھلی آسمان پر

قسم کی شاعری کا تھا۔ استاد حیدر دہلوی، پنڈت امر ناتھ سحؔر، نواب سائل دہلوی اور استاد بیخودؔ کے شاگردوں کی ٹولیاں کہیں جامع مسجد کے چوک اور کہیں ایڈورڈ پارک میں بیٹھی ادبی رسہ کشی میں مصروف نظر آتی تھیں۔ مصرعوں پر تابڑ توڑ گرہ لگانا اور فی البدیہہ شعر کہنا ہی شاعری کی معراج سمجھی جاتی تھی اور شاعری کا موضوع وہی تھا: زُلف و رُخ کی داستان، ہجر اور وصال کے قصّے، عاشق اور رقیب کی کشمکش، محبوب کے جور و جفا کا رونا۔ غرض کہ وہی مساکیت جو اردو شاعروں اور شاعری کا ورثہ ہے اور سب کے حصّے میں آئی تھی۔ اور سب اسی سالخوردہ محبوب کی لاش سے لپٹے ہوئے تھے، جس کے خط و خال تو کیا استخواں بھی باقی نہیں رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان شعرا کی محبّت ہوا میں معلق ہے۔ جس پر زمانے کے گرم و سرد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان شاعروں کا اپنے معاشرے سے کوئی واسطہ نہیں اور اپنے دَور کے معاشی اور سیاسی حالات سے کوئی تعلّق نہیں۔ ان کی شاعری اور شعر کی طرف اس رَویے کا مجھ پر یقیناً ردّعمل ہوا، اگرچہ یہ ردّعمل شعوری نہیں تھا۔ میری نظموں میں محبّت کی طرف اس طرح کا روّیہ اس کی دلالت کرتا ہے۔

اور یہ میری محبّت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی
(مَوت)

تیرے آنسو مرے داغوں کو نہیں دھو سکتے
تیرے پھولوں کی بہاروں سے مجھے کیا لینا
(محرومی)

تم کہاں ہو مری روح کی روشنی
تم تو کہتی تھیں یہ درد پائندہ ہے
(اندوختہ)

علیگڑھ چھوڑنے کے بعد سے آج تک کم و بیش بیس سال کی مسافت ہے۔ اس دوران اپنی شاعری کے بارے میں خاص طور پر، اور اردو شاعری کے بارے میں مجموعی طور پر، بہت کچھ سوچا اور جو کچھ لکھا وہ اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ اس بیس برس کی مدت میں ہندستان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، اور بہت کچھ ہوا۔ ۱۹۴۰ سے ۱۹۶۰ تک آنکھوں نے جو دیکھا اس میں سول نافرمانی، عدم تعاون کی تحریک اور دوسری جنگِ عظیم بھی ہے۔ کانگریس میں ابتری، اشتراکیت کا مقبول ہونا، مسلم لیگ کا وجود میں آنا اور طاقتور جماعت بننا بھی ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کی قلابازیاں اور ۴۵-۴۶ کا سیاسی تعطل بھی ہے۔ بنگال کا قحط بھی ہے۔ مذہب کے نام پر انسانیت کی تباہی اور ایک عظیم ملک کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونا بھی ہے۔ ان تمام واقعات اور سانحات کو جس طرح اور بہت لوگوں نے دیکھا ہے میں نے بھی دیکھا ہے۔ جس طرح اور بہت سے حساس لوگوں نے محسوس کیا ہوگا، اسی طرح میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ چنانچہ 'قلوبطرہ'، 'خاک و خون،' اور جنگ کے بارے میں کئی نظمیں دوسری جنگِ عظیم کا ردِ عمل ہیں۔ نظم 'ریت کے محل' کا محرک ۴۵-۴۶ کا سیاسی تعطل ہے۔ 'ایک سوال' کا پس منظر بنگال کا قحط ہے۔ نظم 'آزادی کے بعد' اور 'پندرہ اگست' تقسیم ملک کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی محرکات ہیں جو میری نظموں کا موضوع بنے، جن کا تعلق میرے اس قسم کے ذاتی حالات سے ہے جن کا بظاہر کوئی سیاسی یا معاشی پہلو نہیں ہے، مگر نجی یا داخلی اور خارجی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ اتنی گھلی ملی ہے کہ ایک کا اثر دوسری پر ناگزیر ہے۔

میری نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مشتمل ہے۔ علامیہ کیا ہے اور شعر میں اس کا استعمال کس طرح ہوتا ہے، میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ علامیہ کی شاعری سیدھی سادی شاعری سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ علامیہ کا استعمال کرتے وقت شاعر کا رویہ بالکل آمرانہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی علامیہ کو کبھی ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ معانی میں استعمال کر جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ کے بظاہر جو معانی ہوتے ہیں وہ علامیہ کی شاعری میں بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری نظم "قلوبطرہ" کا پس منظر دوسری جنگِ عظیم ہے۔ لفظ "قلوبطرہ" کو میں نے نہ اس

کے تاریخی پس منظر میں استعمال کیا ہے، نہ اس کے اپنے معنوں میں۔ 'قلوبطرہ' کے نام کے سے جو اخلاقی پستی وابستہ ہے، یہاں اس تصور کا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ جنگ کے نتائج میں ایک قحبگی کی افزائش بھی ہے۔ 'قلوبطرہ' کا علامیہ استعمال کر کے اسی قحبگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس ایک نام کے ساتھ نظم میں اور بھی کئی نام ہیں، جیسے 'پرویز'، 'انطونی' یہ بھی علامیہ ہی کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔

میں نے مختصر نظمیں کبھی پلان کر کے نہیں کہیں، ہمیشہ چلتے پھرتے کہی ہیں۔ اس کے برعکس طویل نظمیں ہمیشہ پلان کر کے کہی ہیں۔ نظم 'ایک لڑکا' پہلی بار میں نے موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی، تصویر کی شکل میں دیکھی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہو گی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی، اس لیے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا، اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑ میں نیلوفر کے پھول کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کللیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہیں سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد اس لڑکے کو میں نے اکثر اپنے گرد و پیش پایا۔ یہ لڑکا جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا، مگر جو آزاد تھا یا آزاد رہنا چاہتا تھا۔ جس کی فطرت اور نیچر دونوں ایک دوسرے سے قریب تھیں۔ جو معصومیت، سچائی اور ستھرے پن کا علامیہ تھا۔ جو ملوث نہیں تھا کسی کدورت سے بھی۔

وقت کے ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ میں دنیا کی کشمکش میں کھو گیا اور شاعر ہو گیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن میں خیال آیا میں ایک نظم کہوں جس میں اپنے نام کا استعمال کروں۔ بظاہر یہ لڑکا اور اپنے نام والا احساس دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں، مگر در اصل ایک ہیں۔ وہ لڑکا جس کی تصویر کبھی میرے ذہن میں تھی اس کا نام اخترالایمان ہے۔ احساس کی اس دوسری منزل کے بعد مجھے اس لڑکے کا جگہ جگہ کا سفر یاد آیا۔ یہ لڑکا خانہ بدوش تھا۔ کوئی اس کا مستقل گھر نہیں تھا۔ اس کے پاس مناسب اسباب معیشت نہیں تھے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔

مجھے اس لڑکے سے ہمدردی ہو گئی۔ یہ ہمدردی دراصل مجھے اپنے آپ سے تھی مگر چونکہ میں نے اپنے کو اس لڑکے سے الگ کر لیا تھا اس لیے میری شخصیت دب گئی، اس لڑکے کی شخصیت ابھر آئی۔ تخلیقی عمل کی چوتھی منزل یہ تھی میں نے غیر شعوری طور پر اس لڑکے کو اپنا ہیرو بنا لیا۔ مجھے اس لڑکے کے دکھوں اور پریشانیوں سے محبت ہو گئی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا وہ میرا موضوع ہے۔ میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا، اور 'ایک لڑکا' ضمیر انسانیت کا علامیہ بن گیا۔ یہ سب خیالات اور احساسات ایک ہی ساتھ ذہن میں نہیں آئے، ایک ایک کر کے آئے۔ اور پھر میں انھیں بھول گیا۔ ایک سال گزر گیا۔ دو سال۔ تین سال۔ چار سال۔۔ قوس قزح کے سب رنگ غائب ہو گئے۔ پھر ایک دن، رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرع گونج رہا تھا: یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

مجھے معلوم تھا یہ لڑکا کون ہے۔ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی بازپرس کیوں کر رہا ہے؟ مجھ سے میرے اعمال کا حساب کیوں مانگ رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری فعل شروع ہوا۔ معاشرہ کی اخلاقی قدروں میں تضاد، معیشت کے لیے جدوجہد اور قدم قدم پر برائیوں کے ساتھ تعاون، مذہب کی اندرونی و بیرونی شکل۔ ذہن اپنے اعمال کا حساب دینے لگا اور محتسب یہ لڑکا تھا۔ یہ لڑکا جسے میں برسوں سے جانتا تھا۔ اخترالایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔ میں نے نظم کا پہلا بند لکھا اور سو گیا۔

بنتِ لمحات، اشاعت ۱۹۶۹

یہ کھردری، شبہات سے پُر، انتشار آمیز شاعری اس خلوص اور جذبہ محبّت کے تحت وجود میں آئی ہے جو مجھے انسان سے ہے۔ میں اِس کے کرب، اس کی شدّتِ درد کو انتہا پر پہنچ کر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس کی بے چارگی، کم مائگی، بے بسی اور نارسی کے ساتھ ہمدردی ہے، اور میں اس کی کوتاہیوں اور خامیوں کو ایک حد تک قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔

ہر شعری تخلیق اپنے شعری ادب کی روایتوں کے اندر رہ کر ہوتی ہے۔ ایک تجربہ پوری انسانیت کا تجربہ ہو سکتا ہے، جس میں قوم و ملک، مذہب و ملّت اور جغرافیائی حدود کی قید نہیں ہوتی۔ مگر اس تجربے کا اظہار ہم اپنی حدود میں رہ کر کرتے ہیں اور جب ہم ان حدود اور ان روایتوں سے انکار کرتے ہیں، اس پورے علم کی بنیاد پر کرتے ہیں جو ہمیں اپنی روایتوں سے متعلق ہوتا ہے۔ خدا سے متعلق کامو نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے جب ہم اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں، اس میں یہ بات بغیر کہے آ جاتی ہے کہ ہم نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ اسی بات کا اطلاق شعری ادب پر بھی ہوتا ہے۔ جب ہم اپنی کسی شعری تخلیق میں اس کی مروّجہ قدروں، اصولوں اور ضابطوں سے بغاوت کرتے ہیں، یہ بات بین السطور میں ہوتی ہے کہ ہم نے ان قدروں، اصولوں اور ضابطوں کا اعتراف کر لیا ہے، اور اسی میزان کو سامنے رکھ کر میں اپنے شعری ادب کا جائزہ لیتا ہوں اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

آخر میں دو باتیں اور کہوں گا اور اجازت چاہوں گا۔ پہلی بات تو وقت سے متعلق ہے اور دوسری زبان سے۔ میری نظموں میں وقت کا تصوّر اس طرح ملتا ہے جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصّہ ہے۔ اور یہ طرح طرح سے میری نظموں میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی یہ گزرتے ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے، کبھی خدا بن جاتا ہے، کبھی نظم کا ایک کردار۔ 'بازآمد' میں رمضانی قصائی وقت ہے، 'بیداد' میں خدا وقت ہے، 'وقت کی کہانی' میں گردابِ زیست وقت ہے، اور 'کوزہ گر' میں سامری وقت ہے۔ وقت جبریل امیں ہے جو زمیں سے تا حدِ نظر مسلّط ہے۔ ہماری گذرانِ حیات پر ہے، جس کے پاؤں تحت الثریٰ سے بھی نیچے ہیں اور سر عرشِ معلی سے اوپر۔ ساتھ ہی یہ تصوّر نہ مایا کا تصوّر

ہے نہ فنا کا۔ یہ ایک ایسی زندہ اور پائندہ ذات ہے جو 'ہنت' ہے، جو اگر وقت نہ ہوتی تو خدا سے بڑی کوئی چیز ہوتی۔ اس لیے کے اس کے ہاتھوں خدا کی شکل و صورت اور تصوّر بھی بدلتا رہتا ہے۔

زبان سے متعلق یہ ہے کہ ہماری پوری شعری فکر ابھی تک کم و بیش اسی زبان میں بندھی ہوئی ہے، جسے ہم جاگیرداری سماج کی زبان کہتے ہیں۔ اگرچہ آج زندگی کے وہ سب لوازمات بدل گئے ہیں جن کا تعلق اس سماج سے تھا۔ نہ ہم اس طرح رہتے ہیں، نہ اس طرح مکان بناتے ہیں۔ نقل و حرکت کے ذرائع بھی وہ نہیں رہے۔ ہمارا لباس بھی وہ نہیں۔ مگر ہماری تشبیہیں، استعارے۔ تلمیحات اور شعری لوازمات وہی ہیں۔ ہم شاعری کو ابھی تک محفل کی چیز سمجھتے ہیں اور اس کی اچھائی کا اندازہ صرف سُن کر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب خریدنے کی عادت نہیں۔ کتاب خرید کر پڑھنا ہمارا قومی مزاج اور کردار نہیں بنا۔ کم از کم اردو کی صورتِ حال یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری کے مزاج میں ابھی تک علمی سنجیدگی نہیں آئی، اور اس کا اظہار ابھی تک رومانی ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کی کوشش یہ ہے جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دے۔ بات چاہے جہاں سے نکلے اسی کی جوانی تک پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری شاعری ابھی دلگی بازی کی نظر ہو رہی ہے۔ یار لوگ بیٹھتے ہیں، معشوق کے قصّے سنتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی سنجیدہ بات سننے آتے ہیں، نہ کچھ گرہ میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آتی، ہماری شاعری کا ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کوئی دوُر کا واسطہ بھی ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ابھی تک حُسن و عشق کا نعرہ ہے۔ میں نے اس بدعت سے بچنے کی کوشش کی ہے، اور اظہار کو اکثر جگہ نارومانی اور کھردرا رکھا ہے۔

نیا آہنگ، اشاعت ۱۹۷۷

میں آج کے شاعر کو ٹوٹا ہوا آدمی سمجھتا ہوں، اور میری شاعری اسی ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری ہے۔ آج اس ٹوٹے ہوئے آدمی کو یہ محسوس ہونے لگا ہے، بحیثیت مجموعی انسان نے زندگی کو طوائف بنا دیا ہے۔ ایک ہی بات ہر انسان کی زبان سے سنائی دیتی ہے: دو وقت کی روٹی، سر چھپانے کو چھپّر، اور ایک عورت! کیا زندگی بس اتنی ہی سی ہے؟ اتنی ہی بڑی ہے؟

برتن، سکّے، مہریں، بے نام خداؤں کے بُت ٹوٹے پھوٹے
مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکّی چولھے
کند اوزار، زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار، جنھیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہلک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے، کیا مر جاتا ہے؟
(آثارِ قدیمہ)

کیا زندگی کی کوئی اعلیٰ اور برتر قدریں نہیں جن کے لیے انساں جدّ و جہد کرتا ہو؟

شاعر ہی نہیں، آج کا ہر آدمی ٹوٹا ہوا ہے۔ انسان کے آدرش اور عملی زندگی میں اتنا بُعد اور اتنی دوری آگئی ہے کہ بیچ کے خلا کو بھرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس خلا اور دوری نے انسان کو دوعملا اور دوفصلا بنا دیا ہے۔

فرحت کی ماں نے شوہر کے مرنے پر کتنا کہرام مچایا تھا
لیکن عدت کے دن پورے ہونے سے اک ہفتہ پہلے
نیلم کے ماموں کے ساتھ بدایوں جا پہنچی تھی
بی بی کی صحنک، کونڈے، فاتحہ خوانی

جنگ صفین، جمل اور بدر کے قصوں
سیرتِ نبوی، ترکِ دنیا اور مولوی صاحب کے حلوے مانڈے میں کیا رشتہ ہے؟
(کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام)

آج کا ٹوٹا ہوا آدمی کل کے آدمی سے مختلف ہے۔ آج کا آدمی تنگ دِل، تنگ نظر ہے: اس کی عملی قدروں نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

میں پیمبر نہیں
دیوتا بھی نہیں
دوسروں کے لیے جان دیتے ہیں وہ
سولی پاتے ہیں وہ
نامرادی کی راہوں سے جاتے ہیں وہ
میں تو پروردہ ہوں ایسی تہذیب کا
جس میں کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ
شرپسندوں کی آماجگہ
امن کی قمریاں جس میں کرتب دکھانے میں مصروف ہیں
میں ربڑ کا بنا ایسا بوا ہوں جو
دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے سب
پیٹ میں جس کے سب زہر ہی زہر ہے
پیٹ میرا کبھی گر دباؤ گے تم
جس قدر زہر ہے
سب الٹ دوں گا تم سب کے چہروں پہ میں!
(میں تمہاری ایک تخلیق)

میری شاعری کیا ہے، اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا۔ یہ کرب مختلف اوقات میں، مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

جس نے آواز اٹھائی وہ ہوا نذرِ ستم
جو مسیحائی کو آیا رسن و دار ملی
ہر نیا دن نئے آفات کا مظہر ٹھہرا
صبح خوں گشتہ ملی، شام سر افگار ملی

(میں، ایک سیارہ)

دورِ جمہور میں کیا کیا ہوئیں بیداد لکھیں
کوئی حقیقت تو کہیں
بادشاہوں کے سے انداز میں کچھ لوگوں نے
حکم بھیجا ہے بدل ڈالوں میں اندازِ فغاں
طرزِ تحریر و بیاں
رسم خط، اپنی زباں

(میں، ایک سیارہ)

یہ پوری شاعری واحد حاضر متکلم کی شاعری ہے۔ شاعر کی وہ ذات جو زندگی کی ہر تجربہ گاہ میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ذات ہندستان کے ہر آدمی کی نمائندہ ہے۔ ہندستان کا کوئی آدمی بغاوت نہیں کرتا اپنے نامساعد حالات کے خلاف، انہیں چُپ چاپ سہتا ہے۔ اور اگر کوئی ہنگامی قانون نافذ ہو جائے تو چیرہ دست کا ساتھ دینے لگتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ آدمی بزدل ہے، نہیں، خوب لڑ سکتا ہے۔ کشت و خون اور قتل و غارت سے بالکل نہیں ڈرتا، مگر اس کی ساری شجاعت اور جوانمردی فرقہ وارانہ فسادات، صوبہ جاتی اور قومی تعصب تک محدود ہے۔

یہ سب جانتا ہے ہماری شجاعت کی پرواز کیا ہے
ہماری جوانمردی ایک صوبہ جاتی تعصب ہے،
یا فرقہ واری فسادات سے آگے کچھ بھی نہیں ہے

(میرا دوست ابوالہول)

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت اس نے معصوم بچّوں تک کو قتل کر دیا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کے پستان کاٹ ڈالے تھے۔

فسادات دیکھے تھے تقسیم کے وقت تم نے
ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈنٹھلوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستاں بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھیں تھیں کیا بین کرتے؟
(راہِ فرار)

'سب رنگ' میں نے ۱۹۴۳ء میں لکھی تھی۔ یہ نظم ایک بار چھپ چکی ہے۔ مگر تقسیم نہیں ہوئی تھی اور کتب خانے کے گودام میں پڑے پڑے خرد برد ہو گئی۔ اس کے سب کردار جانور ہیں، ایک کے علاوہ۔ اور ہر کردار کسی نہ کسی قدر کا مظاہرہ کرتا ہے، جو ہمارے سماج میں اس وقت بھی تھا جب یہ نظم کہی گئی تھی اور آج بھی ہے۔ جب یہ طویل نظم کہی تھی، انگریزوں کا راج تھا اسی لیے اس کے کرداروں کو علامیہ کی شکل دی تھی۔ میں اس پیش لفظ کو 'سب رنگ' کی اس مناجات پر ختم کرتا ہوں جو بیل نے قوّتِ حیات و نمو کے روبرو کی تھی۔ اس مناجات میں خدا کو اہرمن و یزداں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ بیل محنت کش طبقے کا علامیہ ہے۔

اے خالقِ ہر عیش و غم و ظلمت و ہر نُور
اے غائب و حاضر تری تخلیق کا ہر رنگ
پائندہ ہے اور ہم کو ہے مرغوب بھی لیکن
چھٹتا نہیں امّید کے رخسار سے کیوں رنگ؟

اے خالقِ ہر عشرتِ دو روزہ، ترا فیض
جاری ہے کہیں پھول، کہیں خار میں اکثر
لیکن یہی کیوں ہے کہ ہمیں ملنے نہ پایا
اک لمحہ بھی فرصت کا، رہی جنگ برابر
آفاتِ سماوی، کبھی ارضی سے ابھی تک

جیتے رہے لیکن تری مرضی سے ابھی تک

تو حکم کرے اے غمِ ہستی کے خداوند
شعلہ جو رگ و پے میں تڑپتا ہے بجھا دوں
اور تیرے تصور سے فروزاں کروں راہیں
تو حکم کرے میں وہ تمنائیں جگا دوں
جو دفن ہیں ماضی کی کسی قبرِ کہن میں

سر و ساماں، اشاعت ۱۹۸۳

'گزران' کا ایک لفظ میرے ذہن میں ہے جو میں سمجھتا ہوں پوری زندگی کی اساس ہے۔ آدمی جہاں بھی ہے، خواہی نہ خواہی، گفتنی ناگفتنی، ہر طرح کے قیود و بند میں رہ کر گزران کرتا ہے۔ یہ گزران کوئی سوچا سمجھا ہوا فعل نہیں، ایک افتاد ہے۔ جیسی پڑتی ہے، جھیلتا اوٹتا ہے۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی یہ عینیت ہے، یا وجودیت۔ زندگی جبرِ محض ہے یا وہ مختارِ کُل۔ اگر دیکھا جائے تو گزران کو معنی پہنانے کی کوشش ہی فلسفہ، ادب اور شعر ہے۔

یہ کوئی قنوطی نظریہ نہیں، عین حیات ہے۔ آپ سوچ کر چلیں آگے برچھی کی انی ہے، بڑھے تو سینے میں پیوست ہو جائے گی، تو حوصلہ بڑھتا ہے جینے کا۔ ایک امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اندر سے کوئی بولتا ہے، اوٹیں گے یہ وار بھی، اور انسان چلتا رہتا ہے۔ چلتا رہتا ہے اور قدم قدم پہ شہید ہوتا رہتا ہے۔ ہم روز جہد کرتے ہیں کچھ پانے کے لیے، کچھ حاصل کرنے کے لیے، مگر جہد کبھی کامیاب ہوتی ہے کبھی ناکام۔ اس کامیابی اور ناکامی، پانے اور نہ پانے، کے درمیان جو کرب ہے وہی گزران کا حاصل ہے۔ یہ کرب ہی مسرت کا ایک رُخ ہے۔ یہ کرب ہی تخلیق کی روح ہے۔

اس کرب کو ظاہر کرنے کے لیے وقت کے ساتھ جس طرح اظہار کا انداز اور لفظوں کی نشست و برخاست، استعارے تشبیہیں اور محاورے بدل جاتے ہیں، در و بست بدل جاتا ہے، اسی طرح زبان کا ٹھاٹھ بھی بدل جاتا ہے۔ جاگیرداری سماج کا دیا ہوا، رومانیت میں ملبوس، میٹھا میٹھا، تھکا تھکا نرم اور غنائی لب و لہجہ شاید آج مشینی سماج کے پیدا کردہ مسائل کے اظہار کے لیے ناکافی ہے۔

ایسا نہیں کہ اس بات کا احساس نئے پڑھنے والے اور لکھنے والے کو نہیں مگر وہ اس شکست کا سامنا کرنے کو تیار نہیں جو اکثر نئے راستوں میں پیش آتی ہے۔ دوسرے، شاعری سے لطف اندوز ہونے والا بڑا طبقہ اس مٹھاس کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ کسی بھی طرح کے کھردرے پن اور کرختگی کو گوارا نہیں کرتا۔ کرختگی سے میری مُراد ناشعریت نہیں، صرف کلامِ منظوم نہیں، وہ صفت ہے جو ذہن پر اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح لکڑی پر تیز دھار والا رندہ، مگر یہ دو رویہ سفر تو جاری ہی رہنے والا ہے۔ جس نے کمزور روایتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، اسے نجات مِل گئی۔ جس نے نہیں کیا، وہ ایک خلجان میں مبتلا ہو گیا۔ بات پھر وہیں آ گئی۔ یہ خلجان ہی ان لوگوں کا حصہ ہے، جنھیں اہلِ فکر کہہ لیجیے یا شاعر۔

اس کا آغاز پیغمبروں سے ہوا تھا۔ باغبانی صحرا کی نہاد آفرینش کے آغاز ہی میں رکھ دی گئی تھی۔ اس دن جب آدمی کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ ننگا ہے، اس کی شعوری زندگی کا پہلا دن تھا۔ اس دن شیطان راندۂ درگاہ ٹھہرا تھا، مگر اس نے پروردگار سے کہا قیامت کے دن تک مہلت چاہیے، مجھے اپنا کام کے لیے، اور پروردگار نے کہا، دی۔ اسی دن سے پیغمبر اپنی سی کرتے رہے اور شیطان اپنی سی۔ ایک رسہ کشی ہو رہی ہے، اور پروردگار اپنی تخلیق کی زور آمائی کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔

حیات کا یہ تانا بانا اب تو بن گیا۔ پیغمبر اب نہیں آتے مگر چھوٹے پیمانے پر یہ کام اب شاعر کر رہا ہے۔ شاعر کا کام زندگی میں ایک توازن پیدا کرنا بھی ہے اور اس کے اندر جو حیوان ہے اس کی نفی کرنا بھی۔ جہد تو جاری رہے گی مگر اہلِ فکر و قلم بھی انگلیاں فگار و خامۂ خوں چکاں لیے لیے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔ اس کارواں کا ایک آدمی میں بھی ہوں۔ یہ کام مجھ سے کتنا بن پڑا اس کا جواب میں تو نہیں دے سکتا۔ آپ حکم ہیں۔ میں پہلے بھی سعی کرتا دہا ہوں، آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

زمین زمین، اشاعت ۱۹۹۰

مذہب انسان کے اندر حیوان کی نفی کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس سمت میں پچھلے تقریباً دو ہزار سال قبل تک برابر کوشش جاری رہی، مگر جب سے پیمبری کا سلسلہ ختم ہوا آدمی کی وحشت میں اضافہ ہو گیا۔ اور اب کوئی اخلاقی یا سماجی قانون ایسا نہیں رہ گیا جو درندگی کو نکیل پہنا سکے۔ برائی پر شرمندہ ہونے کی جگہ اس کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اب کوئی قطعہ زمین ایسا نہیں جسے جنّتِ زمینی سے تعبیر کیا جا سکے، مشرق میں بھی مغرب میں بھی۔

اب بار بار سوچنا پڑتا ہے۔ لبنان، فلسطین، لنکا، افغانستان، جنوبی افریقہ، ہندستان، پاکستان کو واقعی ایسے مسائل در پیش ہیں جن کا حل نہیں یا یہ بدامنی گولہ بارود اور کوکین بیچنے والوں کے دلالوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں، اور اگر ان کی کوششوں کا نتیجہ ہیں تو ان کے خریداروں کی عقل کو کیا ہوا؟ دو ہی جذبے ہر جگہ فساد پیدا کیے ہوئے ہیں: وطنیت اور مذہب۔ حب الوطنوں اور پیمبروں کی ساری محنت ہی برباد ہو گئی۔

کسی نہ کسی رنگ میں اس مجموعے کی بیشتر نظموں کا یہی موضوع ہے، اس لیے کہ یہ بات مجھے ہمیشہ پریشان کرتی رہی ہے۔ انسان کے اندر عقل اور استدلال کا کوئی وجود ہے یا محض حیوانی جبلّت اس کے قول و فعل کا فیصلہ کرتی ہے۔

پچھلی نظموں میں 'کوزہ گر' اسی خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔ مگر یہ تو کار لاطائل اور سعیِ رائگاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا کہ ٹڈیاں فصلیں چاٹتی رہیں، درندے زمین کو خون سے لال کرتے رہیں، راستے اور گذرگاہیں کٹے ہوئے جسموں سے پٹی رہیں اور شاعر شاعری کرتا رہے، روتا رہے اس صورت حال پر۔ یہ کیا مقسوم ہوا انسانیت کا؟ اگر اس کا کوئی تدارک نہیں تو پھر کیا انسان اور انسانیت؟ کیا تہذیب اور اس کے تار و پود؟ اور کیا عقل، قانون اور چارہ جوئی؟

دِل آزاری کو انسان نے پیشہ بنا لیا ہے۔ اگر یہی تہذیب اور انسانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے تو ان رومی سلاطین میں کیا بُرائی تھی جو بھوکے شیروں کے پنجرے میں غلاموں اور قیدیوں کو چھوڑ کر خود بھی تماشا دیکھتے تھے اور اپنی رعایا کو بھی دکھاتے تھے۔ مصر کے فراعنہ میں کیا خرابی تھی جو ننگے بدن پر کوڑے مار مار کر غلاموں سے کام لیتے تھے۔ جابر شاہوں اور جمہوریت کے دور میں جینے والے اس عام شہری میں کیا فرق ہے جو مذہب کے نام پر قتل و غارت کو روا رکھتا ہے اور عورتوں

اور بچّوں کی تباہ کاری سے دریغ نہیں کرتا۔ آدمی وحدت الوجود کا بھی قائل ہے اور الگ الگ مذہبوں کی تختیاں بھی گلے میں لٹکائے پھرتا ہے۔ ایکتا میں انیکتا اور انیکتا میں ایکتا بھی دیکھتا ہے اور عقل کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھے ہوئے ہے۔ اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ بلاشبہ وہ اس ذہنی بیماری میں مبتلا ہے، جس کے سبب اس کی شخصیت دو میں بٹ گئی ہے۔ وہ سکیزوفرینیا کا مریض ہے، اسی خیال کا نتیجہ 'لپاہج گاڑی کا آدمی' ہے۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے آدمی زمین پر رہتا ہی نہیں، کرم یا عمل کرتا ہے زمین پر رہ کر اور اس کا پھل ڈھونڈتا ہے، آسمانوں میں سورگ اور جنّت کی شکل میں۔ اس لیے اس کا زمین سے صحیح رابطہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ 'رُویائے صادقہ' اسی فکر اور جذبے کا نتیجہ ہے۔

'کارنامہ' آدمی کے منفی عمل کے مظاہرے کی انتہا ہے۔ اپنی شکست اور نارسائی کا حیوانی ردِّعمل۔ موضوع کے ساتھ زبان کا صحیح استعمال نہ ہو تو اس کی شدّت اور شعری حسیّت میں کمی آ جاتی ہے۔ 'کارنامہ' اور' خمیر' میں اسی بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شاعری کے ساتھ بڑی مشکل یہ پیش آئی ہے کہ وہ ابھی تک غزل کی فضا سے نہیں نکلی۔ یہ بات اس لیے دہرانی پڑ رہی ہے کہ کچھ دوستوں کو جب 'خمیر' اور' کارنامہ' سنائی تو ردِّعمل تھا: زبان ذرا ویسی ہے۔ ویسی کا مطلب میں تو سمجھ گیا مگر ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ ان کے ذہن میں غزل کی غنائیت تھی۔

میں نے کچھ نظموں کی وجہ تخلیق کی نشاندہی کی ہے، مگر وضاحت طلب کچھ اور بھی نظمیں ہیں۔ 'نہ مرنے والا آدمی'، 'خمیر'، 'تسلسل'، 'ارضِ ناکس'، وغیرہ۔ مگر شاعری سمجھانے کی چیز نہیں۔ زیادہ سے زیادہ لفظوں کے معنی بتائے جا سکتے ہیں۔ وہ تو لغت میں بھی مِل جائیں گے، مگر نظم لفظوں تک تو محدود نہیں ہوتی۔ اس سے کہیں آگے تک ہوتی ہے۔ لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ لفظوں کی تہہ داری ایسا پھیلا ہوا عمل ہے اس کی وضاحت کرو تو بچکانا پن محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور پڑھنے والے کا ذہن وہاں تک نہ پہنچے تو نظم اپنا بھرپور مفہوم گنوا دیتی ہے۔ ایمائیت، علامیہ، لفظی تصویر میں داستانوں سے ربط اور پھر ان داستانوں کا پھیلاؤ: ہفت خواں طے کرنے والی بات ہو جاتی ہے۔

اس آباد خرابے میں، سال اشاعت ۱۹۹۶

(اخترالایمان نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اپنی ان نظموں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا جو ان کے مجموعوں میں شامل ہیں، مگر جگہ جگہ کسی واقعے یا خیال کے بیان سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ ایک خاص نظم یا اس کے کچھ مصرعوں کا محرک ہوگا۔ ایسے بیانات کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔ ساتھ ہی نظم یا متعلقہ مصرعے بھی لکھ دیے گئے ہیں، جن کا محرک، مرتبین کے قیاس میں، یہ واقعہ یا خیال ہوا ہوگا۔)

سگھ مدرسہ دراصل ایک یتیم خانہ تھا جو ایک بغیر چھت کی مسجد اور چند پھونس کے چھپّروں پر مشتمل تھا۔ اس سگھ مدرسہ کے مہتمم اور روحِ رواں حافظ اللہ دیا نام کے ایک صاحب تھے۔ گورے چٹّے، قد تھوڑا نکلتا ہوا، طباق سا چہرہ اور پھیلی ہوئی ناک۔ بات چیت میں اچھے تھے اور گوارا آداب و اطوار کے انسان تھے (صفحہ ۱۶)۔

میر ناصؔر کو مرے گو ہو گیا کل ایک سال
ذہن میں باقی ہیں اب تک ان کے سارے خطّ و خال
لانبا قد، کچھ پھیلی پھیلی ناک تھی، چہرہ طباق
دہری کاٹھی، چال میں تھا اک عجب سا طمطراق
آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن سے جھانکتے تھے زُست و خیز
بات کرتے تھے تو یوں لگتا تھا ہیں گرمِ ستیز
بلبلاتے تھے ہنسی کیا تھی مگر اک حُسن تھا
ان کی ہر اک بات میں، دِل کش تھی ان کی ہر ادا
(میر ناصر حسین)

سگھ بستی سے نکلتے ہی دائیں بائیں آموں کے درخت تھے اور بیچ میں کانس کا جنگل۔ بوڑیہ کا راستہ اسی جنگل سے ہو کر گزرتا تھا۔ مارکنڈہ ندی اسی جنگل کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ پانی صرف برسات کے دنوں میں ہوتا تھا۔ باقی دنوں مارکنڈہ ندی سوکھی پڑی رہتی تھی۔ چلچلاتی دھوپ اور یخ بستہ

سردیوں میں جب میں اس ندی کی ریت پر ننگے پاؤں گزرتا تھا تو میرے آنسو نکل آتے تھے۔ تلوؤں کو دھوپ اتنا نہیں جلاتی تھی جتنا سردی جلاتی تھی۔ مجھے اکثر احساس ہوتا ہے جیسے اس بستی میں کئی جنم گزارے تھے۔ کتنا اتار چڑھاؤ دیکھا اور بھٹکتا، جیسے ہفت خواں طے کیا ہو۔ (صفحہ ۱۹)

برہنہ پاؤں جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
(ایک لڑکا)

ایک بار جب میں اسکول سے آرہا تھا راستے میں ایک مہاجن کے لڑکے کی بارات ملی، بہت بھیڑ تھی۔ میں بچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دولھا کے اوپر سے روپے نچھاور کیے جا رہے تھے۔ چاندی کا ایک روپیہ میرے پاس آ کر گرا۔ میں نے اٹھا لیا اور لا کر اماں کو دے دیا۔ عید قریب تھی۔ انھوں نے ہرے رنگ کی زری کا ایک ٹکڑا خریدا اس روپیہ سے اور میرے لیے صدری بنوا دی۔ وہ صدری لٹھے کی شلوار کے ساتھ میں نے عید پر پہنی۔ (صفحہ ۳۱)

یہ جب کا قصّہ ہے سڑکوں پر نئی نئی بجلی آئی تھی
اور مجھے سینے میں دِل ہونے کا احساس ہوا تھا
عید کے دن ہم نے لٹھے کی شلواریں سلوائیں تھیں
اور سویّوں کا زردہ ہمسائے میں بھجوایا تھا
(کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام)

پڑوس میں ایک بڑی سانولی سی لڑکی رہتی تھی۔ میری ہی ہم سِن تھی۔ وہ آکر میرے پاس ہی بیٹھا کرتی تھی۔ ایک بار اپنے ساتھ مندر بھی لے گئی تھی۔ میری اس قدر دِلدادہ تھی کہ جب اسے کوئی کام نہیں ہوتا تھا، میرے یہاں آ جاتی تھی۔ وہ لڑکی، آج جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے، خوشبو کا ایک جھونکا تھی، میرے خیال میں اسے کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ایک بہت اچھا سا، خوبصورت سا، غیر مرئی سا، خیال تھا۔ ایک جھنکار تھی پازیب کی، پائل کی، جھرنے کی۔ (صفحہ ۲۵)

تم مرے ذہن میں یوں آتی ہو جیسے خوشبو
گیت جھرنوں کے، صبا، دوُر کھنکتی چھاگل
بے خبر بہتی ہوئی ندیا، امنڈتی بدری
سات رنگوں کی دھنک، آنکھوں میں پھیلا کاجل

کنج میں چھپ کے چہکتی ہوئی شاما کوئی
گدگدی، لوری، کوئی پیار میں بھیگا آنچل
جھیل ڈوبی ہوئی جلووں میں اُبھرتے دن کے
لاکھ طوفان اُٹھیں، جس میں نہ جاگے ہلچل
تم مری طفلی کا دیکھا ہوا اک خواب سا ہو
اک اُجالا ہو جو نظروں کو بھلا لگتا ہے
اک گھنی چھاؤں ہو، بیٹھا ہوں جہاں میں پہروں
میں تمھیں جانتا ہوں، نام نہیں یاد آتا
(برندا بن کی گوپی)

گلے روز قیصر کے ساتھ میں شام کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ ایک رات کا سفر تھا۔ میں نے اپنے ارے میں کچھ نہیں کہا، نہ اس نے پوچھا۔ میں تو بے سوچے سمجھے اس آگ میں کود پڑا تھا، جلنا ازی تھا۔ قیصر کا مکان کوٹھی نما تھا۔ سسرال کے لوگ متمول معلوم ہوتے تھے۔ مہمانوں کے لیے اہر بنگلہ نما بیٹھک تھی۔ مجھے اس میں ٹھہرایا۔ ایک ملازم کھانے کے وقت کھانا لے آیا۔ گھر کے کسی دمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ رات کو قیصر باہر آئی۔ ہم ڈیوڑھی میں کھڑے باتیں کر رہے ھے۔ باتیں کیا، وہ کہہ رہی تھی میں سُن رہا تھا۔ (صفحے ۵۹ اور ۶۰)

اس دیار میں شاید
قیصر اب نہیں رہتی
وہ بڑی بڑی آنکھیں
اب نہ دیکھ پاؤں گا
ملک کا یہ بٹوارہ
لے گیا کہاں اس کو

ڈیوڑھی کا سناٹا
اور ہماری سرگوشی
'مجھ سے کتنے چھوٹے ہو'
میں نے کچھ کہا تھا پھر
اس نے کچھ کہا تھا پھر
(ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر)

اس وقت دلّی میں جو شاعری ہو رہی تھی، وہ من گڑھت اور فرضی معلوم ہوتی تھی۔ بہت سے اساتذہ تھے: نواب سائل، پنڈت زتشی، استاد بیخود، امر چند ساحر، حیدر دہلوی، آغا شاعر قزلباش، غافل ہریانوی، وغیرہ۔ وہ شاعری سُن کر شاعری اور زندگی میں ربط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کوئی خیال انگیز بات بھی نہیں ہوتی تھی، انسانی زندگی کا کوئی تجربہ یا تجزیہ بھی نہیں لگتا تھا۔ ان اساتذہ کے شاگردوں کو بھی دیکھتا تھا، کبھی کمپنی باغ میں کبھی ایڈورڈ پارک میں۔ ایک بار رُک گیا۔ شاگردوں کی ایک ٹولی مشقِ سخن میں مصروف تھی۔ فی البدیہہ شاعری اور مصرع پر مصرع لگانے کی ذہنی کسرت ہو رہی تھی۔ میں اس مشقِ سخن کی اہمیت اور افادیت پر غور کرنے لگا، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ (صفحہ ۷۱)

اسی اک کوئے جاناں، موئے جاناں، روئے جاناں کو
سمجھتے ہیں کہ معراجِ تخیل ہے، اگر باندھیں
قلم کی شوخیاں سب ختم کر دیں ایک جنبش میں
کسی کو ہمسرِ کعبہ کہیں، شام و سحر باندھیں
(پُرانی فصیل)

شفقی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے رویہ میں وہ دبا دبا پن یا کھنچاؤ نہیں تھا، جو عام طور پر درمیانے طبقہ کی لڑکیوں میں ہوتا ہے جو بات کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے سر پر کوئی بوجھ رکھا ہے۔ من کھبائے منڈیا ہلائے۔ شفقی آرام سے باتیں کرتی تھی۔ ہم دوست ہو گئے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی۔ آنکھوں میں تھوڑا سا نیلا پن تھا۔ مسکراتی تھی تو بہت بھلی لگتی تھی۔ (صفحہ ۷۶)

رنگوں کا چشمہ سا پھوٹا ماضی کے اندھے غاروں سے
سرگوشی کے گھنگرو کھنکے گرد و پیش کی دیواروں سے
یاد کے بوجھل پردے اٹھے، کانوں میں جانی پہچانی
لوچ بھری آوازیں آئیں، جیسے کوئی ایک کہانی
دور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا پھولوں سے کہتا ہو
جیسے جھرنا قطرہ قطرہ رِس رِس کر بہتا رہتا ہو
مدت بیتی ان باتوں کو مضطر آج تلک رہتا ہے
دشتِ ہویدا کا دیوانہ تند بگولوں سے کہتا ہے
آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے، دکھ سے پھور مری نس نس ہے
ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو، ایک دفعہ کی اور ہوس ہے
(شفقی)

لمبی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں، شفقی پشاور جا رہی تھی۔ میں نے کہا، واپس آئیں گی تو ملوں گا۔ اور میں خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں، میں نے ہاسٹل میں فون کیا۔ شفقی فون پر آئی۔ میں نے پوچھا، 'سب خیریت ہے، کب آئیں'۔ 'آپ سے مطلب'، اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ میں نے فون بند کر دیا اور پھر اس سے ملنے نہیں گیا۔

ایک زمانہ گزر گیا۔ میں اِدھر اُدھر وقت گزارتا ہوا جب علیگڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ہندو کالج کے ایک مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے آیا، میرا جی میرے ساتھ تھے۔ مقابلے کے بعد باہر نکلا تو دیکھا سامنے شفقی کھڑی ہے۔ میں رُک گیا۔ وہ پوچھنے لگے یہ لڑکی تمہارے لیے کھڑی

ہے۔ میں نے کہا ہاں مگر میں اس سے ملوں گا نہیں، اور مڑ کر دوسری طرف سے باہر نکل آیا۔ آج اس بات کو زمانے گزر گیا مگر مجھے ابھی تک ملال ہے۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اب تو وہ کہیں ڈاکٹر ہو گی۔ یہ واقعہ یاد آتا ہوگا تو معلوم نہیں کیا ردِّ عمل ہوتا ہو گا اس کے اوپر۔ (صفحہ ۷۸)

یہ درس گاہ کوئی ہے جہاں کھڑی ہو تم
اندھیرے اور اُجالے کے درمیاں تنہا
تمہارے ذہن میں کیا ہے مجھے نہیں معلوم
مگر مجھے ہے فقط ایک ہی گماں، تنہا
جو راہ روکے کھڑی ہو تو ہے ملال تمھیں
اُس ایک بات کا پہنچا ہے جس سے رنج مجھے
مرے خلوص کا احساس ہو گیا ہے تمھیں
اور اب تمھاری یہی ایک صرف کوشش ہے
کہ اپنی شیریں زبانی سے اندمال کرو
وہ زخم بھر دو لگا ہوگا جو مجھے شاید
جو دی تھی تم نے اذیّت، وہ میں نے لوٹا دی
تمھارے لب نہ کھلے تھے کہ میں پلٹ آیا
قدم تو بڑھتے رہے شرق، غرب، شمال، جنوب
کہاں کہاں لیے پھرتے رہے مرے حالات
مسافتوں کی گراں باریاں لیے سر پر
تمام عمر چلا، دن کوئی تھا میری نہ رات
مگر یہ مَیں نہیں، ہمزاد تھا مرا شاید
کہ مَیں تو، راہ جہاں میری تم نے روکی تھی
وہیں کھڑا ہوں گنہ گار کی طرح چپ چاپ
(ایک جامد تصویر)

ان دنوں مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ادب اور تاریخ کے علاوہ دوسری زبانوں کے کلاسکی ادب اور شاعری کے ترجے جو مِل سکے تھے پڑھے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ تقریر کرتے وقت زورِ بیان دکھانے کے لیے حوالے غلط دے جاتا تھا، مگر سننے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ زورِ بیاں میں سب نکل جاتا تھا۔ اپنے زورِ بیان پر مجھے ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہو گیا تھا۔ (صفحہ ۷۰)

میں جب طفلِ مکتب تھا، ہر بات ہر فلسفہ جانتا تھا
کھڑے ہو کے منبر پہ پہروں سلاطینِ پارین و حاضر
حکایاتِ شیرین و تلخ ان کی، ان کے درخشاں جرائم
جو صفحاتِ تاریخ پر کارنامے ہیں، ان کے اوامر
نواہی، حکیموں کے اقوال، دانا خطیبوں کے خطبے
جنھیں مستمندوں نے باقی رکھا، اس کا مخفی و ظاہر
فنونِ لطیفہ، خداوند کے حکم نامے، فرامین
جنھیں مسخ کرتے رہے پیر زادے، جہاں کے عناصر
ہر اک سخت موضوع پر اس طرح بولتا تھا کہ مجھ کو
سمندر سمجھتے تھے سب علم و فن کا، ہر اک میری خاطر
تگ و دَو میں رہتا تھا، لیکن یکایک ہوا کیا یہ مجھ کو
یہ محسوس ہوتا ہے سوتے سے اٹھا ہوں، ہلنے سے قاصر
کسی بحر کے سونے ساحل پہ بیٹھا ہوں گردن جھکائے
سرِ شام آئی ہے، دیکھو تو ہے آگہی کتنی شاطر!
(آگہی)

سانپ میرے لیے ہمیشہ ایک فوبیا بنا رہا ہے۔ شاید اس کا سبب میری ماں کا خواب ہو۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا، میرے پیدا ہونے سے پہلے انھوں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنی گود میں ایک سانپ کھِلا رہی ہیں۔ میں وہ خواب سُن کر بہت انگیخت ہوا تھا۔ سانپ سے کہیں نہ کہیں میری مٹ بھیڑ ہوتی ہی رہی تھی۔ (صفحہ ۱۰۵)

میری ماں اب مٹی کے ڈھیر کے نیچے سوتی ہے
اُس کے جملے، اُس کی باتیں، جب وہ زندہ تھی، کتنا برہم کرتیں تھیں
مری روشن طبعی، اس کی جہالت
ہم دونوں کے بین اک دیوار تھی جیسے
'رات کو خوشبو کا جھونکا آئے، ذکر نہ کرنا
پیروں کی سواری جاتی ہے
دن میں بگولوں کی زد میں مت آنا
سائے کا اثر ہو جاتا ہے
بارش، پانی میں گھر سے باہر جانا تو چوکس رہنا
بجلی گر پڑتی ہے، تو پہلوٹی کا بیٹا ہے
جب تُو میرے پیٹ میں تھا، مَیں نے اک سپنا دیکھا تھا
گود میں اپنے سانپ لیے بیٹھی ہوں، تیری عمر بڑی لمبی ہے
لوگ محبّت کر کے بھی تجھ سے ڈرتے رہیں گے'
میری ماں اب ڈھیروں مَن مٹی کے نیچے سوتی ہے
سانپ سے مَیں بے حد خائف ہوں
ماں کی باتوں سے گھبرا کر مَیں نے اپنا سارا زہر اُگل ڈالا ہے
لیکن جب سے سب کو معلوم ہوا ہے میرے اندر کوئی زہر نہیں
اکثر لوگ مجھے احمق کہتے ہیں (تحلیل)

باقر مہدی، وہ اکثر شام کو آیا کرتے تھے۔ باقر ان نقادوں میں ہیں جنھوں نے میری شاعری کو پڑھا اور اس پر لکھا۔ باقر مہدی کہنے کو ایک فرد ہیں مگر انھیں اجتماع کہا جا سکتا ہے۔ جب بہت خوش ہوتے ہیں اور دوستوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو اکیلے اتنا ہنستے اور شور کرتے ہیں کہ بہت سے آدمی مل کر بھی نہیں مچا سکتے۔ ادب کا بہت غائر مطالعہ کیا ہے، قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر۔ (صفحہ ۱۶۸)

یہ مَیں نے مان لیا تیرا ذہنی سرمایہ
کثیر دولتِ بیدار ہے عزیزِ من
یہ مَیں نے مان لیا تیری تشنگیِ علم
کچھ اور، اور بھی کچھ، اور جاننے کی لگن
لیے پھری ہے کتب خانوں میں تجھے دن رات
وہ کِرمِ خوردہ کتابیں، متاعِ شعر و سخن
وہ قلمی نسخے، وہ بوسیدہ شاہ پارے جنھیں
کبھی ہوا لگی شاید، نہ روشنی کی کرن
لئیمِ وقت نے جن کو چھپا دیا تھا کہیں
وہ نادرات جنھیں کھا گئی نمی، سیلن
جنھیں ملی ہے اماں صرف بند قفلوں میں
وہ گنج ہائے گراں مایہ، جانِ فکر و فن
تمام نوکِ زباں پر ہیں، یہ مجھے تسلیم
کیا ہے تو نے انھیں جزوِ روح و جزوِ تن
(کرمِ کتابی)

میں ایک مدّت سے اس نتیجے پر پہنچا ہوا ہوں کہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر ان مسائل کا کوئی حل نکل آتا ہے، مگر اس حل سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہ زمین پر محض اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ اس زمین پر خیالات کا اور تصوّرات کا جو بھی منصوبہ ہے، وہ انسان کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک مقصد دینا چاہتا ہے، اس لیے مسلسل ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذّت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں بچتا، اس لیے وہ روز نئے مسائل اٹھاتا رہتا ہے اور خوش ہے اپنی زندگی کا مقصد پورا کر رہا ہے۔ (صفحہ ۱۷۵)

ہمارے لیے کھوکھلا لفظ جمہوریت ہے، تقاریر ہیں لیڈروں کی
ہمارے لیے روزناموں کے صفحات ہیں، اشتہارات ہیں نیم جنسی
ہمارے لیے دیوتاؤں کے بُت ہیں، خدا کے فرامین ہیں اور عقبیٰ
جو بد رنگ ہے حال کی طرح اور کورے لٹھے کی بُو سے بھری ہے
ہمارے لیے صرف روٹی کی جدوجہد
عورتوں کے برہنہ بدن کی تمنا سے آگے کہیں کچھ نہیں ہے
ہماری رگوں میں جو تیزاب ہے اس کی شدت کبھی کم نہ ہو گی

(میرا دوست، ابوالہول)

(بمبئی میں) میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک سڑک تھی جسے ورودا روڈ کہتے تھے۔ وہ اب بھی ہے۔ شراب پر پابندی لگنے کے بعد وہ علاقہ ایک بہت بڑا شراب کا اڈہ بن گیا۔ بہت سے گھروں میں شراب کشید ہونے لگی تھی۔ اکثر گھروں میں بیچی بھی جانے لگی تھی۔ (صفحہ ۲۳۰)

بادہ نوشی ہزار بند ہوئی
محتسب کیا کسی کا داتا ہے
اک صدا گونجتی ہے گلیوں میں
پینے والو خدا پلاتا ہے
ہر بدر رَو ذخیرہ گاہ بنی
ہر طرف ساقیوں کا تانتا ہے

(تماشا)

میں ہیوسٹن (ٹیکساس) کے اسپتال سینٹ لیوک میں چلا گیا اور میرا آپریشن ہو گیا۔ پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک والو (valve) بدلا گیا۔ آپریشن کے بعد مجھ کئی روز ہوش نہیں آیا اور سلطانہ باہر بیٹھی گھنٹوں اس بات کا انتظار کرتی رہتی تھیں مجھے کب ہوش آتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۲)

خبر نہیں تھی دوا کی بُو باس بھی ہے شامل رفاقتوں میں
تمام گل پوش موسموں کا زمانہ اتنا گریز پا تھا
پڑا تھا میں سینہ چاک آگے، لہو میں ڈوبا ہوا تھا نشتر
کھڑا تھا جرّاح سانس روکے، زمانہ کچھ دیر تھم گیا تھا
(گریز پا)

ایسے موقعوں پر انسانی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایسے کئی پروڈیوسر تھے جنھوں نے امجد کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے بہانے گوا کے ان ہوٹلوں کو، جہاں انھیں ٹھہرایا گیا تھا، پکنک گاہ اور تفریح کا اڈا بنا لیا تھا۔ بے دریغ ڈھیروں مرغ مچھلیاں شکم میں اتاری گئیں، اور شراب لنڈھی۔

میں نے، ایک زمانہ ہوا، ایک فلم دیکھی تھی۔ جب مردے کی چتا کو آگ دی گئی، جنازے میں شریک ہونے والوں میں سے ایک اس آگ پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ یہ منظر میں نے اس وقت دیکھا جب امجد کا اچانک انتقال ہوا۔ جنازہ اٹھانے کے وقت ہر ایکٹر کی کوشش تھی کہ وہ پہلے جنازے کو کاندھا دے، اس لیے کہ چاروں طرف کیمرے لگے ہوئے تھے اور اس پس منظر کے ساتھ ہر ایکٹر تصویر کھنچوانے کا خواہشمند تھا۔ (صفحے ۲۳۵، ۲۳۶)

قراں ی آیتوں کے ساتھ ارواحِ اب و جد کو
خمیری روٹیوں اور قورمے کے ساتھ رخصت کر دیا ہم نے
خدا بھی خوش ہوا ہوگا کہ زیبائے جہاں خوش ہیں
عمل سے اپنے منہ کھولے تھا دوزخ، بھر دیا ہم نے
(نیاز)

فصل ۱

گرداب، اشاعت ۱۹۴۳

مقدمہ: میرا جی اور مختار صدیقی

مطبوعہ: ساقی بُک ڈپو، دہلی

نیند سے پہلے

ٹوٹتے نشہ کی تلخی ہے ابھی تک باقی
دُکھ سے بھر پور ہیں یہ مُند چھلکتے ہوئے جام
جگمگاتے نہیں، ہنستے نہیں اب رنگ محل
دب گیا نیند کی بانہوں میں کوئی حشر خرام

سیمگوں خواب بِسرنے لگے، افسانہ ہوئے
چاند نے بوئی تھیں جو کرنیں،وہ مرجھا بھی گئیں
سو گئیں خاک پہ شبنم کے طمانچے کھا کر
کلیاں جو کھلنے ہی والی تھیں وہ کمھلا بھی گئیں
گردشِ ارض میں گھل جاؤں گا، کھو جاؤں گا
جم کے رہ جائے گا اُمّید کی پلکوں پہ لہو
جھک کے رہ جائے گی سنگِ درِ جاناں پہ جبیں
میرے بوسیدہ لبادے میں رہے گی نہ سکت
ماہ و سال اور لگا دیں نیا پیوند کہیں

اشک بہہ جائیں گے آثارِ سحر سے پہلے
خون ہو جائیں گے ارمان، اثر سے پہلے
سرد پڑ جائے گی بجھتی ہوئی آنکھوں کی پکار
گرد برسوں کی چُھپا دے گی مرا جسمِ نزار
جاگتے جاگتے تھک جاؤں گا، سو جاؤں گا

نقشِ پا

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقشِ پا
سُلگ رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں فضا میں جذب ہو گئیں
جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کون سا جہان ہے، ازل نہیں، ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
ادھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اس طرف خبر نہیں
عدم خراب تر ملے، نہ موت ہو نہ زندگی؟

ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں
مگر یہ آہنی رسن، یہ حلقہ ہائے بندگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو گئے
میں نقشِ پائے عمر ہوں، فریب خوردہ خوشی!

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آسکیں
یہ زرد زرد صورتیں، یہ ہڈیوں کے جوڑ سے؟
ہوا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آسکے
دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے؟

سوگ

مرنے دو مرنے والوں کو، غم کا شوق فراواں کیوں ہو
کس نے اپنا حال سُنا ہے، ہم ہی کس کا درد نباہیں
یہ دنیا، یہ دنیا والے اپنی اپنی فکروں میں ہیں
اپنا اپنا توشہ سب کا، اپنی اپنی سب کی راہیں
وہ بھی مُردہ، ہم بھی مُردہ، وہ آگے ہم پیچھے پیچھے
اپنے پاس دھرا ہی کیا ہے، ننگے آنسو، بھوکی آہیں

محلکے

تصورات کی شمعیں جلا کے دیکھ تو لوں
سیاہ خانۂ ہستی سجا کے دیکھ تو لوں
غمِ حیات پہ آنسو بہا کے دیکھ تو لوں
تری نظر سے ذرا دور جا کے دیکھ تو لوں

پیے ہوئے ہوں مئے غم سنبھل نہیں سکتا
ابھی تو ہوش میں دو گام چل نہیں سکتا
ابھی تو زیست کا عنواں بدل نہیں سکتا
محبتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ تو لوں

یہ گھر بنا کے گرا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
دیے جلا کے بجھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
یہ ساری بزم اٹھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
خیال و خواب کی دنیا بسا کے دیکھ تو لوں

سیاہ و کہنہ محلکوں سے اُس طرف کوئی
گھنی، دبی ہوئی پلکوں سے اُس طرف کوئی
پکارتا ہے دھندلکوں سے اُس طرف کوئی
یہ دو قدم ہیں انھیں بھی اٹھا کے دیکھ تو لوں

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
اُفق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں
بس ایک بار سہی ڈگمگا کے دیکھ تو لوں؟

اظہار

دبی ہوئی ہے مرے لبوں میں کہیں پہ وہ آہ بھی جو اب تک
نہ شعلہ بن کر بھڑک سکی ہے نہ اشکِ بے سود بن کے نکلی
گھٹی ہوئی ہے نفس کی حد میں، جلا دیا جو جلا سکی ہے
نہ شمع بن کر پگھل سکی ہے، نہ آج تک دُود بن کے نکلی
دیا ہے بے شک مری نظر کو وہ ایک پرتو جو درد بخشے
نہ مجھ پہ غالب ہی آسکی ہے، نہ میرا مسجود بن کے نکلی

مآل

پھر خزاں آئی اٹھا رختِ بہار
سخت مبہم ہے محبّت کا مآل
چوم لینے دے شہابی رخسار
کتنا تاریک ہے فردا کا خیال

مجھ کو اس وقت یہ احساس نہیں
جھوٹ گو جھوٹ ہے رنگین تو ہے
تو کسی اور کی میراث نہیں
ایک ناکام سی تسکین تو ہے

مٹ ہی جائیں گے یہ کمزور نقوش
جم کے بہہ جاتی ہے قطبین پہ برف
زندگی ہائے نہ فردا ہے نہ دوش
عمر ہو جاتی ہے اک آہ میں صرف!

مل گئیں دور نگاہوں کی حدود
تو مرے درد کا درماں نہ سہی
ایک لمحے کو اٹھا دے یہ قیود
میرے سینے میں یہ پیکاں نہ سہی

من چلے خواب ہیں سامانِ شکیب
زندگی درد ہو آزار نہیں
تلخ آنسو ہیں نگاہوں کا فریب
روح کچھ اتنی گرانبار نہیں

تخت بہم ہے محبّت کا مآل
چوم لینے دے شہابی رخسار
کتنا تاریک ہے فردا کا خیال
پھر خزاں آئی اٹھا رختِ بہار

لغزش

جھلملا کر بُجھ گئے پاگل اُمیدوں کے دیے
تو سمجھتی ہے کہ میں ہوں آج تک اندوہگیں
وقت کے ہاتھوں نے آخر مندمل کر ہی دیا
اب مرے معصوم زخموں سے لہو بہتا نہیں

جب حنائی انگلیوں کی جنبشیں آتی ہیں یاد
جذب کرلیتا ہوں آنکھوں میں لہو کی بوند سی
اب مگر ماضی کی ہر شے پر اندھیرا چھا گیا
اور ہی راہوں سے گزری جارہی ہے زندگی
ذہن میں ابھرے ہوئے ہیں چند بیجاں سے نقوش
اور ان میں بھی نہیں ہے کوئی ربطِ باہمی

خواب دیکھا تھا کسی دامن کی چھاؤں میں کبھی
ایک ایسا خواب جس کا مدعا کوئی نہیں
میں اکیلا جارہا ہوں اور زمیں ہے سنگلاخ
اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں

راستے کٹتے ہوئے گم ہوگئے ہیں دھند میں
دھند سے آگے خلا ہے راستا کوئی نہیں

یہ بھیانک خواب کیوں مغلوب کرتے ہیں مجھے
دودھیا راتیں سحر کے جھٹپٹے میں کھوگئیں
اور تیری نرم باہیں، مجھ سے اب ناآشنا
اور ہی گردن کے حلقے میں لپٹ کر سوگئیں
مسکرا اُٹھتا ہوں اپنی سادگی پر میں کبھی
کس قدر تیزی سے یہ باتیں پرانی ہوگئیں!

موت

"کون، آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم؟
"آہ احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی
اور سرمایۂ انفاس پریشاں نہ رہا
میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد مری
زنگ آلود محبّت کو تجھے سونپ دیا
"کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ نگاہوں کا چراغ"
"اس قدر ہوش سے بیگانہ ہوئے جاتے ہو"
"تم چلی جاؤ، یہ دیوار پہ کیا ہے رقصاں
میرے اجداد کی بھٹکی ہوئی روحیں تو نہیں؟
پھر نگاہوں پہ امنڈ آیا ہے تاریک دھواں
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ یہ مایوس چراغ
آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد مری
ٹوٹنے والی ہے انفاس کی زنجیرِ گراں
"توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا"

"جی الجھتا ہے، مری جان پہ بَن جائے گی"
"تھک گیا آج، شکاری کی کماں ٹوٹ گئی
لوٹ آیا ہوں بہت دور سے خالی ہاتھوں
آج امّید کا دن بیت گیا، شام ہوئی
زندگی! آہ، یہ موہوم تمنّا کا مزار
میں نے چاہا بھی مگر تم سے محبت نہ ہوئی"
"کہہ چکے اب تو خدا کے لیے خاموش رہو"
"ایک موہوم سی خواہش تھی فلک چھونے کی
زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
سرد ہاتھوں سے مری جان مرے ہونٹ نہ سی
گر کبھی لوٹ کے آجائے وہی سانولی رات
خشک آنکھوں میں جھلک آئے نہ بے سود نمی
"زلزلہ، اُف یہ دھماکا، یہ مسلسل دستک
بے اماں رات کبھی ختم بھی ہوگی کہ نہیں؟
"اُف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت
میرے سینے میں دبی جاتی ہے آواز مری
تیرگی، اُف یہ دھندلکا، مرے نزدیک نہ آ
یہ مرے ہاتھ پہ جلتی ہوئی کیا چیز گری؟
آج اس اشکِ ندامت کا کوئی مول نہیں
آہ احساس کی زنجیرِ گراں ٹوٹ گئی

اور یہ میری محبّت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی"
"کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو؟"
"کیا خبر، وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو
"زلزلہ، اُف یہ دھماکا، یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
اف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت"
"کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو؟"
"توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا!"

محرومی

تو بھی تقدیر نہیں درد بھی پائندہ نہیں
تجھ سے وابستہ وہ اک عہد، وہ پیمانِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
خواب انگیز نگاہیں، وہ لبِ درد فریب
اک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں، نہ کانٹے، نہ غبار
شام کے سائے میں واماندہ سحر بیٹھ گئی
کارواں لوٹ گیا، مِل نہ سکی منزلِ شوق
ایک امید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی

ایک دو راہے پہ حیران ہوں کس سمت بڑھوں
اپنی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوں شاید!
میں بھی گردش گہہِ ایام کا زندانی ہوں
دَرد ہی دَرد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید!
زیرِ مژگاں تپشِ آہ کے پگھلائے ہوئے
ڈبڈباتے ہوئے تاروں سے مجھے کیا لینا؟
تیرے آنسو مرے داغوں کو نہیں دھو سکتے
تیرے پھولوں کی بہاروں سے مجھے کیا لینا؟
اپنے انجام کی تشویش اب آئندہ نہیں!

مسجد

دُور برگد کی گھنی چھاؤں میں خاموش و ملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی و حال، گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹّی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

حسرتِ شام و سحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
ان پریشان دعاؤں کو سُنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دِل تھام لیا کرتی ہے!

یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب
اِس کو مسکن کے لیے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
اور محرابِ شکستہ میں سمٹ کر پہروں
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے

ایک بوڑھا گدھا دیوار کے سائے میں کبھی
اونگھ لیتا ہے ذرا بیٹھ کے جاتے جاتے
یا مسافر کوئی آجاتا ہے، وہ بھی ڈر کر
ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے آتے آتے!

فرش جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
کالعدم ہوگیا تسبیح کے دانوں کا نظام
طاق میں شمع کے آنسوں ہیں ابھی تک باقی
اب مصلّٰے ہے نہ منبر، نہ مؤذن، نہ امام

آچکے صاحب افلاک کے پیغام و سلام
کوہ و در اب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبہ کی شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھوگئی دشتِ فراموشی میں آوازِ خلیل

چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دُھلی چادر اپنی
اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ، بس اک
چشم نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی

ایک مَیلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو، کبھی آ کے بجھاتے بھی نہیں
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دُور سے، فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی!

نئی صبح

کالے ساگر کی موجوں میں ڈوب گئیں دھندلی آشائیں
جلنے دو یہ دیے پرانے خود ہی ٹھنڈے ہو جائیں گے
بہہ جائیں گے آنسو بن کر، روتے روتے سو جائیں گے
اندھے سایوں میں پلتے ہیں مبہم سے غمگین فسانے
دُکھ کی اک دیوار سے آ کر ٹکرا جاتے ہیں پروانے
دُودِ فسردہ کی انگڑائی لے بن بن کر ٹوٹ رہی ہے
سرخ زباں کی نازک لو پر جاگ رہی ہے ایک کہانی
ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں سونی سونی ہے کچھ محفل
دُھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے کب سورج نکلے، بستی جاگے غم مٹ جائیں!

وداع

سونی راہوں میں بگولے ہیں ابھی گرمِ سفر
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا
دُور مغرب کے کسی گوشہ تنہائی میں
جس جگہ شام و سحر بیٹھ کے ستاتے ہیں
اپنی تقدیر، غمِ بارِ سفر سے تھک کر
اور پھر تازہ نفس ہو کے پلٹ آتے ہیں
کیا خبر میں بھی کسی روز پلٹ ہی آؤں
پر کبھی تازہ نفس ہو بھی سکوں گا کہ نہیں؟
یہ بھی ممکن ہے کہ میں لوٹ کے آ ہی نہ سکوں
سانس پھر سانس ہے کچھ آہنی زنجیر نہیں
اور زنجیر بھی ہوگی تو کہاں تک آخر
ٹوٹ جائے گی کسی روز، ابد گیر، نہیں؟
روز خورشید دہکتے ہوئے تانبے کی طرح
ایک لاوے کے سمندر میں ڈھلک جاتا ہے
اور اک خون اُگلتے ہوئے چشمے کے قریب
چھوڑ جاتا ہے تذبذب میں، سلگتی ہوئی شام
کیا خبر پاؤں مرا ساتھ بھی دیں گے کہ نہیں
کیا خبر کیا ہے مرے عزمِ سفر کا انجام؟

روک آنکھوں سے امنڈتا ہوا سیلابِ الم
بیٹھ جائیں نہ کہیں میری اُمیدیں تھک کر!
اجنبی دیس کی ویران گذرگاہوں میں
میں اگر پا نہ سکا عشرتِ منزل کا سراغ
لَوٹ آوٗں گا تصور میں تری سمت کبھی
گُل نہ ہوجائیں کہیں تیرے دریچہ کے چراغ
آہ یہ دیدۂ پُر اشک میں امّید کی سَوت
خشک ہوتی ہے نہ سیلابِ فنا بنتی ہے
تو مرا نقشِ قدم چشمِ فسردہ سے نہ دیکھ
دیکھ وہ راہ گذر ہانپ رہی ہے اب تک
میں جسے روند کے آیا ہوں بہ اندازِ جنوں
کیا سفر مَوت ہے تُو کانپ رہی ہے اب تک؟
کتنا دِل کش ہے دھندلکا سا افق کے نزدیک
آسماں چوم ہی لینے کو ہے تقدیرِ زمیں
پھر مرا خون مچلتا ہے ارادے بن کر
پھر کوئی منزلِ دشوار بلاتی ہے مجھے
پھر کہیں دشت وجبل ڈھونڈ رہے ہیں مجھ کو
پھر کہیں دُور سے آواز سی آتی ہے مجھے
اُڑ چلا اوس کے مانند ستاروں کا ہجوم
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاوٗں گا!

فیصلہ

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کردوں!

اپنے شوریدہ ارادہ کو اپاہج کر لوں
اپنی مجروح تمنا کا مداوا نہ کروں
اپنی خوابیدہ محبّت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصوّر کے سہارے کے لیے
ایک بھی شمع سر راہ جلایا نہ کروں

اپنے بے سود تخیّل کو بکھر جانے دوں
زندگی جیسے گزرتی ہے گزر جانے دوں!

چند لمحوں میں گزرنے کو ہے ہنگامہ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر
سرد پڑنے لگا اجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردشِ یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار فسانوں کا اثر ٹوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بہ کمر

سوچ میں ڈوب گئے راہگذر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں؟

میں ابھی آخری مے نوش ہوں مے خانے میں
دیکھتا کیا ہے مری سمت، بڑھا، جام بڑھا
لا صراحی کو مرے پاس شکستہ ہی سہی
چھیڑ ٹوٹے ہوئے تاروں کو کراہیں تو ذرا
سوچتا کیا ہے اُنڈیل، اور اُنڈیل، اور اُنڈیل
سرد پڑتی ہوئی محفل کے تکدّر پہ نہ جا

اپنے بیدار تفکّر کی ہلاکت پہ ہنسوں
آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں!

پرانی فصیل

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے اُلجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمعِ امیّد و تمنّا لو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت، کوئی کروٹ نہیں لیتی

خراب و شورہ آلودہ زمیں خاموش رہتی ہے
یہاں جھینگر نہ جانے کس زباں میں گیت گاتے ہیں
یہاں چوہے متاعِ زندگی سے سرخ رُو ہو کر
مہذّب بستیوں میں جا کے اکثر لوٹ آتے ہیں

یہاں شبنم کے قطروں میں نزاکت بھی نہیں ہوتی
یہاں بھیگی ہوئی راتوں میں ہنگامے نہیں ہوتے
یہاں کوئی کسی کی زُلف سے کھیلا نہیں کرتا
یہاں دُنیا سے اکتائے ہوئے آکر نہیں روتے

یہاں سورج شعاعیں پھینک دیتا ہے بہ مجبوری
مگر پھر بھی کسی گوشے میں کچھ تاریک سے خاکے
جنھیں کرنیں نظر انداز کرجاتی ہیں جلدی میں
بنا کرتے ہیں، بنتے ہی رہے ہیں اک زمانے سے

یہاں اسرار ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازو ہواؤں کے
یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پر دفن ہیں گزری ہوئی تہذیب کے نقشے

مری نظروں نے قتل وخوں، ہوس رانی بھی دیکھی ہے
یہاں جذبات بھی عریاں کیے ہیں کج کلاہوں نے
یہاں لوٹی ہوئی پونجی پہ ماتم بھی کیا آ کر
یہاں تھک کر سہارا بھی لیا ہے بادشاہوں نے

مرے اک سمت اک دنیا ہے رنگا رنگ کی مظہر
وہاں ہر طنز کا پہلو ہے ہر اک دِل نوازی میں
کبھی میں اک اچٹتی سی نظر سے دیکھ لیتی ہوں
وہاں تضحیک کے نشتر چُھپے ہیں چارہ سازی میں

وہاں سہمی ہوئی ٹھٹھری ہوئی راتوں نے دیکھے ہیں
دریدہ پیرہن، عصمت نگوں سر، بال آوارہ
گریباں چاک، سینہ وا، بدن لرزاں، نظر تیرہ
خمِ ابرو میں درماندہ جوانی محوِ نظارہ

وہاں احساس کی جنسِ گراں قیمت نہیں رکھتی
وہاں کا ہر نفس مانگی ہوئی دنیا میں رہتا ہے
مسرّت تول کر لیتے ہیں چاندی کی ترازو میں
خوشامد زندگی کی ہر ادا میں کار فرما ہے

وہاں عورت فقط اک زہر آلودہ سا کانٹا ہے
جو چبھ سکتا ہے لیکن درد کا حاصل نہیں ہوتا
وہاں بھوکی نگاہیں گھورتی ہیں تنگنائے میں
مگر سب دیوتا ہیں کوئی اہلِ دِل نہیں ہوتا

ہر اک ناواقفِ منزل سمجھتا ہے کہ واقف ہے
وہاں سب رہنما ہیں، کوئی منزل ہے، نہ راہی ہے
وہاں چھپنے ہوئے جذبے ہیں سرمایہ ادیبوں کا
صریرِ خامۂ نادار بھی شہرت کی پیاسی ہے

وہاں ہر فکر کی جدّت پہ طعنے پیش ہوتے ہیں
وہاں شاعر مشینوں کی طرح سانچوں میں ڈھلتے ہیں
وہی اُگلے ہوئے لقمے طبائع کا سہارا ہیں
انھیں ویران راہوں پر کھڑے ہیں، آنکھ ملتے ہیں

اسی اک کوئے جاناں، موئے جاناں، روئے جاناں کو
سمجھتے ہیں کہ معراجِ تخیّل ہے اگر باندھیں
قلم کی شوخیاں سب ختم کردیں ایک جنبش میں
کسی کو ہمسر کعبہ کہیں، شام وسحر باندھیں

کہیں روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں، ہر طرف ہر سُو
غلاظت آشنا، جھلسے ہوئے انسان کے پلّے
یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے کوکھ پھٹ جاتی مشیّت کی
تمنّاؤں میں ان کی رات دن کھینچے گئے چلّے

غرض اک دَور آتا ہے، کبھی اک دَور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں، نہ منزل ہوں، نہ جادہ ہوں!

قلوبطرہ

شام کے دامن میں پیچاں نیم افرنگی حسیں
نقرئی پاروں میں اک سونے کی لاگ
رہ گذر میں یا خراماں سرد آگ
یا کسی مطرب کی لے، اک تشنۂ تکمیل راگ!

ایک بحرِ بے کراں کی جھملاتی سطح پر
ضوفگن افسانہ ہائے رنگ و نُور
نیلے نیلے دو کنول موجوں سے چُور
بہتے بہتے جو نکل جائیں کہیں ساحل سے دُور

چاند سی پیشانیوں پر زرفشاں لہروں کا جال
احمریں اڑتا ہوا رنگِ شراب
جم گئی ہیں اشعۂ صد آفتاب
گردنوں کے پیچ وخم میں گھل گیا ہے ماہتاب

عشرتِ پرویز میں کیا نالہ ہائے تیز تیز
اُڑ گیا دن کی جوانی کا خُمار
شام کے چہرے پہ لوٹ آیا نکھار
ہو چکے ہیں ہو رہے ہیں اور دامن داغ دار

اس کا زریں تختِ سیمیں جسم ہے آنکھوں سے دُور
جامِ زہر آلود سے اُٹھتے ہیں جھاگ
چونک کر انگڑائیاں لیتے ہیں ناگ
جاگ انطونیؔ محبت سو رہی ہے جاگ جاگ!

جمود

تم سے بے رنگیِ ہستی کا گلہ کرنا تھا

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا
آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میلہ ہے پریشان سی امیدوں کا
چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں
پُرمحن راہ گذاروں کا خیال آیا ہے

ساقی و بادہ نہیں، جام و لبِ جو، بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں!

زندگی کے دروازے پر

پا برہنہ و سراسیمہ سا اک خمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ و دوُد
مضطرب ہو کے گھروندوں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ برسوں کا جمود؟

اِن پپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اُجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی درِ زیست، کہاں ڈھونڈیں گی
ان کو وہ تشنگیِ شوق میسّر ہی نہیں

جیسے صدیوں کے چٹانوں پہ تراشے ہوئے بُت
ایک دیوانے مصوّر کی طبیعت کا اُبال
ناچتے ناچتے غاروں سے نکل آئے ہوں
اور واپس انھیں غاروں میں ہو جانے کا خیال

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
اور یہ رقصِ طلسمانہ کے رنگیں سائے
اس کی نظروں کو دیے جاتے ہیں پیہم دھوکے
جیسے بس آنکھ جھپکنے میں وہ اُڑ کر آئے

شہپرِ موت کسی غولِ بیاباں کی طرح
قہقہے بھرتا ہے، خاموش فضاؤں میں، صدا
کانپتے کانپتے اک بار سمٹ جاتی ہے
ایک تاریک سا پردہ یونہی آویزاں رہا

کوئی دروازہ پہ دستک ہے نہ قدموں کا نشاں
چند پُرہول سے اسرار تہہ سایہ در
خود ہی سرگوشیاں کرتے ہیں، کوئی جیسے کہے
"پھر پلٹ آئے یہ کم بخت وہی شام و سحر؟"

ناچتا رہتا ہے دروازے کے باہر یہ ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ و دود
زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر توڑ ہی دے بڑھ کے کوئی قفلِ جمود؟

آمادگی

ایک اک اینٹ گری پڑتی ہے
سب دیواریں کانپ رہی ہیں
اَن تھک کوششیں معماروں کی
سر کو تھامے ہانپ رہی ہیں

موٹے موٹے شہتیروں کا
ریشہ ریشہ چھوٹ گیا ہے
بھاری بھاری، جامد پتّھر
ایک اک کر کے ٹوٹ گیا ہے

لوہے کی زنجیریں گل کر
اب ہمّت ہی چھوڑ چکی ہیں
حلقہ حلقہ چھوٹ گیا ہے
بندش بندش توڑ چکی ہیں

چونے کی اک پتلی سی تہہ
گرتے گرتے بیٹھ گئی ہے
نبضیں چھوٹ گئیں مٹّی کی
مٹّی سے سَر جوڑ رہی ہے

سب کچھ ڈھیر ہے اب مٹّی کا
تصویریں، وہ دِل کش نقشے
پہچانو تو رو دوگی تم
گھر میں ہوں، باہر ہوں گھر سے

اب آؤ تو رکّھا کیا ہے
چشمے سارے سُوکھ گئے ہیں
یوں چاہو تو آ سکتی ہو
میں نے آنسو پونچھ لیے ہیں

تنہائی میں

میرے شانوں پہ ترا سر تھا نگاہیں نم ناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے؟
گھر گیا ذہن غمِ زیست کے اندازوں میں
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا!

اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
دن کے دامن پہ ہیں دھبّے سے ریا کاری کے
اور مغرب کی فناگاہ میں پھیلا ہوا خوں
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے

دُور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اس کے پیچھے سے جھجکتا ہوا اک گول سا چاند
اُبھرا بے نور شعاعوں کے سفینہ کو لیے

میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ اگر تُو مِل جائے
زندگی گو ہے گراں بار پہ اتنی نہ رہے
چند آنسو غمِ گیتی کے لیے، چند نفس
ایک گھاؤ ہے جسے یوں ہی سیے جاتے ہیں
میں اگر جی بھی رہا ہوں تو تعجب کیا ہے
مجھ سے لاکھوں ہیں جو بے سود جیے جاتے ہیں
کوئی مرکز ہی نہیں میرے تخیّل کے لیے
اس سے کیا فائدہ جیتے رہے اور جی نہ سکے
اب ارادہ ہے کہ پتّھر کے صنم پُوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتّھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلتا ہو دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

یا کہیں گوشۂ اہرام کے سناٹے میں
جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں
ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کس کو پُوجوں؟

اب تو مغرب کی فنا گاہ میں وہ سوگ نہیں
عکسِ تحریر ہے اک رات کا ہلکا ہلکا

اور پُر سوز دھندلکے سے وہی گول سا چاند
اپنی بے نور شعاعوں کا سفینہ کھیتا
اُبھرا نمناک نگاہوں سے مجھے تکتا ہوا
جیسے گھل کر مرے آنسو میں بدل جائے گا
ہاتھ پھیلائے اِدھر دیکھ رہی ہے وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اِس کو ہرا کر نہ سکا؟

یوں گزارے سے گزر جائیں گے دن اپنے بھی
پَہ یہ حسرت ہی رہے گی کہ گزارے نہ گئے

خون پی پی کے پلا کرتی ہے انگور کی بیل
گر یہی رنگِ تمنا تھا چلو یونہی سہی
خون پیتی رہی، بڑھتی رہی کونپل کونپل
چھاؤں تاروں کی شگوفوں کو نمو دیتی رہی
نرم شاخوں کو تھپکتے رہے ایام کے ہاتھ
یونہی دن بیت گئے، صبح ہوئی شام ہوئی
اب مگر یاد نہیں کیا تھا مآلِ امید
ایک تحریر ہے ہلکی سی لہو کی باقی
بیل پھلتی ہے تو کانٹوں کو چھپا لیتی ہے
زندگی اپنی پریشاں تھی پریشاں ہی رہی

چاہتا یہ تھا مرے زخم کے انگور بندھیں
یہ نہ چاہا تھا مرا جام تہی رہ جائے!

ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے وہ بول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
گھر گیا ذہن غمِ زیست کے اندازوں میں
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا؟
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
میرے شانوں کو تھپکتا غمِ تنہائی میں!

جواری

گہرے سائے ناچ رہے ہیں دیواروں پہ محرابوں میں
سہمے ہوئے ہیں ہارنے والے، جیتنے والے ہار رہے ہیں
پونجی نقدی جو کچھ بھی ہے لے کر داؤ مار رہے ہیں
چہروں پر ہے موت سی طاری، آنکھیں ناؤ گردابوں میں

مِتّی آشا اکساتی ہے، کھیل جواری کھیل جواری
جو بھی ہارا ہار چکا ہے، اب کی بازی جیت سمجھنا
ہار بھی تیری ہار نہیں، یہ جیت نگر کی ریت سمجھنا
سانسیں قیدی، خوف کے پہرے، گھیرے ہے اک چار دواری

تجھ سے پہلے اور کھلاڑی جیتے بھی ہیں ہارے بھی ہیں
ہار اور جیت کا سودا ہے یہ، دُبدھا کیسی ڈرنا کیسا
پانسا پھینک جھجکتا کیوں ہے، جیتے جی ہی مرنا کیسا
ویرانوں میں طوفانوں میں سائے بھی ہیں سہارے بھی ہیں!

ایک ہی بازی، ایک ہی بازی، کوئی بیٹھا اکساتا ہے
تن کے کپڑے، سر کی پگڑی بیچ، یہ بازی اپنانی ہے
ہم چشموں میں بات رہے گی، مایا تو آنی جانی ہے
ہار بھی تیری ہار نہیں ہے، من کو من ہی سمجھاتا ہے

ہونٹ چبائے پہلو بدلے سب کچھ بیچا بازی جیتی
پھر لالچ میں آکر بیٹھے، آنکھیں چمکیں من لہرایا
ایسے کھوئے خود کو بھولے، کھیل میں کچھ بھی یاد نہ آیا
جب اٹھے تو جیب تھی خالی کون یہ پوچھے کیسی بیتی

گہرے سائے اندھے دیپک ناچ رہے ہیں جاگ رہے ہیں
دیواروں کے حلقے میں ہے بازی داؤ اور جواری
کیا جانے یہ اندھی بازی کس نے جیتی کس نے ہاری
کیا جانے کیوں سانجھ سویرا آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی
سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے، کون کسی سے بازی جیتے
بیت گئی ہے جیسی بیتی، باقی چاہے جیسی بیتے
وہم و جنوں کی، رنگ فسوں کی پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی!

تصوّر

پھر وہی مانگے ہوئے لمحے، وہی جامِ شراب
پھر وہی تاریک راتوں میں خیالِ ماہتاب
پھر وہی تاروں کی پیشانی پہ رنگِ لازوال
پھر وہی بھولی ہوئی باتوں کا دھندلا سا خیال
پھر وہ آنکھیں بھیگی بھیگی دامنِ شب میں اُداس
پھر وہ امیدوں کے مدفن زندگی کے آس پاس
پھر وہی فردا کی باہیں، پھر وہی میٹھے سُراب
پھر وہی بیدار آنکھیں، پھر وہی بیدار خواب
پھر وہی وارفتگی، تنہائی، افسانوں کا کھیل
پھر وہی سرگوشیاں، سپنے، وہ دیوانوں کا کھیل
پھر وہی رخسار، وہ آغوش، وہ زلفیں سیاہ
پھر وہی شہرِ تمنا، پھر وہی تاریک راہ
زندگی کی بے بسی، اُف وقت کے تاریک جال
درد بھی چھٹنے لگا، امید بھی چھٹنے لگی
مجھ سے میری آرزوئے دید بھی چھٹنے لگی
پھر وہی تاریک ماضی، پھر وہی بے کیف حال

پھر وہی بے سوز لمحے، پھر وہی جامِ شراب
پھر وہی تاریک راتوں میں خیالِ ماہتاب

پگڈنڈی

ایک حسینہ درماندہ سی، بے بس، تنہا دیکھ رہی ہے
جیسے یونہی بڑھتے بڑھتے رنگِ افق پر جا چُھولے گی
جیسے یونہی افتاں خیزاں جا کر تاروں کو چُھولے گی
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا، دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں ستاتی مڑتی، بڑھ جاتی ہے آزادی سے

راہی کی آنکھوں میں ڈھلتی، گرتی اور سنبھل جاتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں میں تاروں کی نیمیں خواب کا دھارا بُنتی
دن کی روشن قندیلوں میں میداں میں آوارا بُنتی
ندیوں سے چشموں سے مِلتی کوسوں دُور نکل جاتی ہے

پھولوں کے اجسام کچلتی ذروں کے فانوس جگاتی
درماندہ اشجار کے نیچے شاخوں کا واویلا سنتی
ہر نووارد کے رستے میں نادیدہ اک جال سا بُنتی
بڑھ جاتی ہے "منزل" کہہ کر کلیاں زیرِ خاک سلاتی!

غم دیدہ پسماندہ راہی تاریکی میں کھوجاتے ہیں
پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بنا دیتے ہیں
آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں
وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہوجاتے ہیں

راہ کے پیچ و خم میں اپنا دامن کوئی کھینچ رہا ہے
فردا کا پُرپیچ دھندلکا ماضی کی گھنگھور سیاہی
یہ خاموشی، یہ سناٹا اس پر اپنی کور نگاہی
ایک سفر ہے تنہا راہی، جو سہنا تھا خوب سہا ہے

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یونہی تاریکی میں بَل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی اُلجھا دیکھ رہی ہے

یہ سورج یہ چاند ستارے راہیں روشن کرسکتے ہیں؟
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے؟
آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں؟
ہم سے اتنا بَن پڑتا ہے جی سکتے ہیں مرسکتے ہیں!

فصل ۲

سب رنگ، سالِ تصنیف ۱۹۴۳

(سالِ اشاعت کتاب پر نہیں لکھا، مگر 'نیا آہنگ' کے دیباچے میں درج ہے کہ یہ طویل نظم ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی۔ کتاب کے 'ابتدائیہ' میں اخترالایمان نے ۱۳ تلک روڈ، پونا، کا پتہ لکھا ہے، جہاں وہ ۴۷' اور ۴۸' میں رہتے تھے۔ قیاس ہے کہ 'سب رنگ' کتاب کی صورت میں ۱۹۴۷ء میں چھپی تھی۔)

سانپوں، کتّوں اور خچروں کے نام

ابتدائیہ: اخترالایمان

مطبوعہ: اوریئنٹ بک سنٹر، بمبئی

مقام: برِاعظم ایشیا کا ایک جنگل

تماشائی: شجر و حجر

وقت: اندھیرے اجالے کے درمیان

زمانہ: ہمارا آپ کا

کردار

آدم: بدیسی

سانپ: سیاسی رہنما

گدھا: پٹے ہوئے شہزادے

بندر: ناقص تفکر

چڑیا: ابن الوقت

گینڈا: تخریبی عنصر

خچر: والئی ریاست

بیل: محنت کش

ہُدہُد: مذہبی عنصر

کتا: خطاب یافتہ

اُلو: اہنسا

پہلا گدھ: سرمایہ دار

دوسرا گدھ: سرمایہ دار

قوّتِ حیات و نمو

ابتدائیہ

یہ جنگل جس میں اس ناٹک کے کردار رہتے ہیں اس میں آدم کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے اس کے آثار پتھروں اور دھاتوں پر ملتے ہیں اور کاغذ کی ایجاد کے بعد سے ظاہر ہے کاغذ ہی پر ملنے چاہیے۔

اس جنگل کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔کہتے ہیں جب دنیا بھر کے جانور اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہاں کے جانور روشنی میں تھے۔ اس جنگل کی سیر کے لیے اورجانوروں کے عادات وخصائل جاننے بہت سے سیاح اب سے پہلے بھی آئے ہیں اوراب بھی آتے رہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس جنگل کے جانور صرف آپس میں لڑتے ہیں۔ اگر کوئی لڑنے والا باہر سے آجائے تو یہاں جو کمزور ہیں وہ آنے والے طاقتور کا ساتھ دے کراپنے ہی ہم جنسوں کا خاتمہ کرا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسی میں ان کی بھلائی ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برے جانورحملہ آور کا ساتھ دے کر اچھے جانوروں کا خاتمہ کرادیتے ہیں، لیکن اس حملہ آور کے ہاتھوں خود بھی نیست و نابود ہوجاتے ہیں۔

اس جنگل کے جانوروں کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں ہمیشہ ایک تندخوآدم کی ضرورت رہی ہے اور آدم کی بدبختی یہ ہے کہ اس نے جب اپنی عادت چھوڑی جانور ہوگیا۔

اس جنگل کے چرچے ہمیشہ سے دور و نزدیک رہے ہیں۔ دنیا والے اس جنگل تک پہنچنے کے راستے ڈھونڈتے تھے مگر نہیں ملتے تھے۔ انھیں راستہ ڈھونڈنے والوں میں ایک شخص کولمبس بھی تھا جو نکلا تھا اس جنگل کی نیت سے مگر جا پہنچا کہیں اور۔

دوسرے اس جنگل تک پہنچنے کی کوشش کوئی اس لیے نہیں کرتے تھے کہ یہاں روشنی کا چشمہ بہت پرانا ہے بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ یہاں سونا بافراط ہے اور یہ کہ درختوں پر اُون اگتی ہے۔

یہاں جس قدرمؤرخ اور سیاح آئے انھیں صرف اس قدر معلوم تھا کہ یہ جنگل

جانوروں سے بھرپور ہے لیکن اس دریافت کا سہرہ موجودہ آدم کے سر ہے کہ اس نے یہ معلوم کیا کہ یہاں کئی قسم کے جانور ہیں اور یہ کہ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں کسی قسم کا خوف یا لالچ دے کر بڑی آسانی سے رام کیا جاسکتا ہے۔

جو جانور آدم کو بہت پسند آئے ان میں خچر اور کتے کا نمبر پہلے آتا ہے اور سانپ کا بعد میں۔ گدھوں کو اس نے کبھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی اس لیے کہ وہ جانتا تھا ایک مرتبہ زیر ہونے کے بعد یہ جانور کسی کام کا نہیں ۔

الو کے بارے میں مورخوں کی رائے یہ ہے کہ اگر چہ وہ 'شانتی' پسند ہے مگر اس کے اردگرد رہنے والے گدھ 'شوشو' ہی کا جپ کیا کرتے ہیں اور یہ کہ الو کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی گیان دھیان میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں کرتے۔

بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ اگر چہ بہت نمایاں نہیں لیکن کتا، سانپ اور گدھا سب ہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔

گینڈے کے بارے میں رائے ہے کہ یہ نہ اپنے ہی کام آتا ہے نہ غیروں ہی کے، اس لیے سب اس سے بیزار رہتے ہیں۔

الو کے بارے میں اس رائے پر سب متفق ہیں کہ جو کچھ یہ کرتا ہے اس میں نیت کی برائی کو دخل نہیں ہوتا مگر نتیجہ ہمیشہ ایسا نکلتا ہے جس سے جنگل والوں کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے۔

کچھ پرانے مورخوں کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک زمانے میں اس جنگل پر ہُدہُد کا طوطی بولتا تھا۔ ان دنوں عنانِ ملک گدھا سنبھالے ہوئے تھا اور اسے قدم قدم پر ہُدہُد کی مدد درکار ہوتی تھی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا، اس لیے دونوں ان دنوں کی یاد میں محض چند آنسو ٹپکا کر رہ جاتے ہیں اور یہ کہ پونچھنے والے بھی نہیں ملتے۔

چڑیا اور اس کا حُسن محض طاقت کا ساتھ دیتے ہیں اور بندر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسے شروع ہی سے جھک مارنے کی عادت ہے۔اس کی سیاست صرف لفظوں اور اعتراضوں

تک محدود ہے۔

یہ واقعہ جو میں نے اس ناٹک میں قلم بند کیا ہے آج ہی کل کی بات ہے۔ اور بیل کہتے ہیں ہوتا اُس زمانے میں بھی تھا مگر بات نہیں کرتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ قوتِ حیات و نمو کے ایما سے ہورہا ہے۔ مگر اب اس کا یہ خیال نہیں۔

یہ جو کچھ میں آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں اسے کہنے کو تو میں نے ناٹک کہہ دیا مگر ناٹک کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر پوری نہیں اترتی اس لیے آپ کو اجازت ہے کہ آپ جو نام چاہیں میری اس کاوش کو دے دیں۔

چونکہ اس جنگل کے صحیح واقعات بہت سے لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انھیں سب کی بھلائی کے لیے قلم بند کردوں۔ چند باتیں اور بھی تھیں جو اس وقت میرے ذہن سے نکل گئیں۔ اگر پھر کبھی موقعہ ملا، حواس ٹھکانے آئے اور اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو انھیں بھی شامل کردوں گا۔

ایک بات چلتے چلتے اور کہہ دوں اور وہ ہے قوتِ حیات و نمو کے دربار سے متعلق۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ پانی میں کود کر یہ راز بھی دریافت کرتا چلوں لیکن جس قوت کی مدد سے وہاں تک پہنچا تھا اس نے روک دیا، کہنے لگی ممکن ہے پانی نہ ہو شراب ہی ہو جیسا کہ بہت لوگوں کی رائے ہے۔

میں نے کہا اور وہ روایت جو ہے کہ جو اس پانی کی گہرائی اور روشنی کی حقیقت جاننے کے لیے گیا واپس نہیں آیا۔ اس بارے میں کیا رائے ہے؟ جواب ملا چھوڑو اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہو اور میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس سلسلے میں خاموش ہی ہو جاؤں۔

سردست صرف اس قدر ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اسے "سب رنگ" کے نام سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دیکھیے۔

اختر الایمان

۱۳ تلک روڈ، پونا

افتتاحیہ

(زمان و مکان برسوں کا گرد و غبار اپنے چہروں پر لیے نمودار ہوتے ہیں۔)

مکان : صدیاں بیتیں اس جنگل میں جتنے پنکھ پکھیرو تھے سب
الگ الگ رہتے آئے تھے پورب کوئی پچھم کوئی
اپنے اپنے کنبے سب کے، بالک بچے ننھے بالے
آنکھوں کا سکھ ، دِل کی ٹھنڈک ،دھرتی سونی ،سوئی سوئی
کوسوں تک خالی ہی خالی، پڑی تھی جیسے کوئی سہاگن
تکتے تکتے راہ کسی کی بس اک پل کو سو جاتی ہے
ہرے بھرے میدان اکیلے، لیے ہوئے بھرپور جوانی
اونگھ رہے تھے چپکے چپکے ، ناچ رہی تھی اک ایسی لے
گیت کی بن بن ،جس کی دُھن سے کھیل رہی تھی روح زمیں کی
زمان : کالے کالے پنکھ پکھیرو، ان کے ننھے منے بالے
اس نیلے آکاش کے نیچے دھرتی کو سینے سے لگائے
وہ جنگل کی دھرتی جس نے اب تک پیٹ بھرے تھے سب کے
اب تک تن ڈھانپے تھے سب کے، اپنے پیار کے گہرے سائے
ڈالے سب پر، چپکی بیٹھی، اپنے روپ سے کھیل رہی تھی
کالے کالے پنکھ پکھیرو اس دھرتی کے بچے بالے
اپنی ماں کی گود میں بیٹھے ، بجلی اور بادل سے ڈر کر
کبھی چمٹ جاتے تھے ماں سے، کبھی جھکا دیتے تھے گردن
یونہی چلتا جاتا تھا یہ دن اور رات کا دھیما چکّر

مکان　　پھر اترے بھورے بادل سے کچھ گھر کر آئے
اتنے برسے اتنے برسے کالے کالے پنکھ پکھیرو
اس پانی میں ڈوب گئے سب، اس پانی کی لال تھی رنگت
جیسے کوئی نرمل جل میں کہیں سے لاکر گھول دے گیرو

زمان : یہ بادل پھر دھیرے دھیرے اس دھرتی کے باسی بن کر
گنگا جمنا کی وادی میں اپنا ڈیرا لے کر اترے
کالے پنکھ پکھیرو پکڑے مار پیٹ کے داس بنایا
کالی زمیں سے پیار جتا کے پھول اگائے ستھرے ستھرے
یہ بادل جب سوکھ گئے تو اور اٹھے اترے بادل
برسے اور برس کر پہلے بھورے بادل جو چھائے تھے
ان کو اپنا میت بنایا پیار کے رشتے ناتے جوڑے
ان گیتوں میں اور بڑھائے پہلوں نے جو کچھ گائے تھے

مکان : جب یہ بادل برس برس کر سوکھ گئے تو اک دن ایسا
طوفاں آیا سب تھرائے اور زمیں نے پلٹا کھایا
جنگل کے سب نئے پرانے باسی جو تھے اس طوفاں میں
بھٹکے اور ٹکرائے آخر ایک زمانہ یہ بھی آیا

زمان : ایک نے ایک کی صورت دیکھی جانے اور انجانے سب ہی
اس نیت سے مل کر بیٹھے آؤ اپنا روگ مٹائیں
اپنے اپنے بھاؤ ہیں سب کے اپنے طور طریقے سب کے
دیکھیں کیسی کٹتی ہے اب، پچھلی باتوں پر کیا جائیں

(زمان و مکان یہ کہہ کر آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں)

پہلا رنگ

"ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں
بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے"
(کتاب الحکمت)

(ایک وسیع میدان میں جنگل کے تمام جانور جمع ہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ اگر چہ آدم کی تمام تر قوت کا دارومدار ہم پر ہے اس کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو ہمارا آقا، اشرف المخلوقات اور نہ معلوم کن کن ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے اس دعوے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیے۔ سانپ صدرِ محفل ہے۔ گدھا بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے)

گدھا : تمام حضرات سن رہے ہیں
مجھے یہ کہنا ہے اہلِ محفل
بہت گزاری ہے سو کے ہم نے
ہمیں ولے غفلتوں کا حاصل
ملا بھی کچھ ہے تو اک اندھیرا
مگر ہمیں چاہیے سویرا

(گدھا ابھی اصل موضوع تک آ بھی نہیں پاتا کہ قریب کے پیڑ کی ایک شاخ سے بندر شور مچاتا ہوا زمین پر کودتا ہے)

بندر : نقطۂ اعتراض صاحبِ صدر
نقطۂ اعتراض صاحبِ صدر

سانپ : خاموش خاموش، سنیے، خاموش!
کہیے، کہیے، بابا ، خاموش!

بندر : قاعدہ ہے کسی مجلس میں اگر
اتفاقاً جو خواتین بھی ہوں
تین سو مرد ہوں یا تین ہزار
عورتیں ان میں اگر تین بھی ہوں
پھر بھی اخلاق یہ کہتا ہے کہ جب
ابتداء ہو تو انھیں سے ہو خطاب
اور میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں
حُسنِ اخلاق کی مٹّی سے خراب

سانپ : اور کچھ اس کے سوا؟

بندر : دوسری چیز یہ ہے بندہ نواز
کم سے کم مجھ کو یہ معلوم نہ تھا
آپ ہیں صدر، یہ کیوں کر کیسے
آپ کو صدر بھلا کس نے چنا؟

سانپ : میرے احباب نے جن سے میں نے
خود کہا تھا کہ میں اس قابل ہوں
مجھ کو ہی صدر بنایا جائے
سب سمجھتے ہیں میں کس قابل ہوں؟

بندر : ہم تو سنتے تھے کہ جمہور کا راج
اک حقیقت ہے مگر آج یہاں
آن کر عقدہ کھلا دھوکا ہے

یونہی اک وہم میں ہے ایک جہاں

سانپ : آپ ہی کہیے مرے بھائی بھلا
مجھ میں کیا صدر کے اوصاف نہیں ؟

بندر : چنداحباب کے ایما سے جناب
بن گئے صدر، مگر باقی سب
کیوں گدھے بن گئے یوں
اختلاف ان کو تھا جب؟

گدھا : جنابِ صدر مری ذات پہ ہے یہ حملہ
یہ ذاتیات پہ حملے مجھے پسند نہیں
اب ان سے کہیے کہ الفاظ اپنے واپس لیں
مری زبان بھی چاہوں تو کوئی بند نہیں

سانپ : بیٹھیے بیٹھیے، ہاں کہیے جناب
مجھ میں کیا صدر کے اوصاف نہیں؟
(سانپ سوالیہ نگاہوں سے بندر کی طرف دیکھتا ہے)

سانپ : دیکھیے میری چمک، میری لچک، میرا حسن
دیکھیے چستی و چالاکی و نرمی میری
دیکھیے رنگ مرا، رنگ کی گہرائی مری
دیکھئے زہر مرا، زہر کی گرمی میری
(بندر کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے)

سانپ : مست ہوکر جو کسی بین پہ میں ناچ اٹھوں
بین کوئی بھی ہو مقصد مرا حل ہوتا ہے
دیکھتے دیکھتے پتھر کو بھی پانی کردوں

میں اگر جھوٹ کو سچ کہہ دوں تمھیں ساتھ نہ دو
اس کا جو میرا مخالف ہو، مرا دشمن ہو
کنڈلی جو مار کے بیٹھوں تو سمٹ جائے زمیں
ڈس کے پلٹوں جو کسی کو وہیں افسانہ بنے!
میرا ڈسنا مری پھنکار مرا رقصِ حسیں
سب ہیں ذو معنی، انھیں جان سکو گے تم کیا
زہر اگلوں تو جھلس جائیں مکاں اور مکیں
غالباً تم ابھی واقف نہیں اس بھید سے بھی
زہر کی لاگ بنا کوئی سیاست ہی نہیں؟
تم ابھی بچّے ہو اس قضیے میں کیوں پڑتے ہو؟
مجھ میں اک صدر کے اوصاف ہیں سب جانِ حزیں

بندر : پھر بھی کہتا ہوں مجھے
اختلاف آپ سے ہے
یہ طریقہ تو نہیں
چند احباب کو لے
صدر بن جائے کوئی؟

سانپ : (بگڑ کر) آپ کو میری صدارت نہیں منظور اگر
آپ جا سکتے ہیں یاں رہنے پہ مجبور نہیں!

بندر : (چلا کر) کیا یہی ہے جسے جمہور کا راج
کہتے ہیں لوگ مگر
جس میں جمہور کی آواز نہیں
کیا یہی ہے وہ شجر

جس کے پھل صرف وہی کھائیں جو باثروت ہیں
جن کی بھیڑوں کے گروہ
ہر پنہ گاہ میں ہیں
ہر چراگاہ میں ہیں!

(سانپ پھنکار کر بندر پر جھپٹتا ہے اور اسے ڈس لیتا ہے۔ بندر تڑپ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے)

سانپ : (پرسکون لہجہ میں) مجھ میں وہ زہر بھی ہے
جس کی ہر آن سیاست کے لیے
گو ضرورت ہے مگر مصلحتاً
اپنے ہم جنسوں کی الفت کے لیے
آج تک میں نے چھپا رکھا ہے
یوں ہی اک ڈھونگ رچا رکھا ہے!

(ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ گدھا ہمت کر کے پھر کھڑا ہوتا ہے)

گدھا : جنابِ صدر اجازت ہے اب مجھے کہ میں پھر
اس اپنی بات کو دہراؤں اور ختم کروں؟

سانپ : کہیے، ہاں چھوڑیے اس قصہ کو
ایسے قضیے تو ہر اک محفل میں
ہوتے ہی رہتے ہیں کیا کیجیے مگر
بُعد ہے موج میں اور ساحل میں

گدھا : میں کہہ رہا تھا کہ آدم، وہ جس کی قوت کا
مدار صرف ہمارے قویٰ پہ ہے خود کو

(گدھا بات دوبارہ شروع بھی نہیں کرنے پاتا کہ محفل میں پھر کہیں شور مچنے لگتا ہے)

سانپ : کیا تماشا ہے یہ ؟
حضرات ذرا سوچیے تو آپ یہاں
کس لیے آئے ہیں، کیا مقصد ہے

(مگر شور برابر جاری رہتا ہے۔ سانپ گردن ابھار کر دیکھتا ہے۔ گینڈا اپنے سینگ اور پچھلے پاؤں سے مٹی اڑا رہا ہے۔ سانپ نرم ہو کر)

سانپ : دیکھیے سوچیے تو آپ ہی جب
جانِ محفل جنھیں کہیے وہ لوگ
اس طرح شور مچائیں گے تو پھر
دوسرے کیسے رہیں گے خاموش؟

گینڈا : (سخت لہجہ میں) میں کسی شخص کا غلام نہیں
میں کسی چیز کا نہیں پابند
میں تو جو چاہتا ہوں کرتا ہوں
کوئی شئے گر کہے کہ مجھ کو گزند
آکے پہنچا سکے گی، ناممکن
وہ ہو آدم کہ اور کوئی گدھا!

گدھا : دیکھیے صاحبِ صدر
پھر مری ذات پہ طنز

گینڈا : چپ رہو، غل نہ مچاؤ احمق !
(صدر سے مخاطب ہو کر)
کوئی پروا نہیں محفل کی مجھے

ایک ہنگامہ ہے اور کچھ بھی نہیں
میں نے ہنگامے بہت دیکھے ہیں
یوں بھی جاتا ہے بھلا درد کہیں
فکرے سے زخم کہیں بھرتا ہے
بددعاؤں سے کوئی مرتا ہے؟

(گینڈا جونہی باہر جانے لگتا ہے کہ ایک کونے سے ایک نسوانی آواز آتی ہے)

آواز : چرچر چرچر، چوں چوں چوں چوں،
کھی کھی کھی کھی، کھوں کھوں کھوں کھوں!

(سب اس طرف دیکھتے ہیں۔ اجتماع کی سب سے خوب صورت اور آزاد چڑیا گینڈے کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے)

چڑیا : میرا بھی اب ہنگاموں سے
کوئی ذہنی میل نہیں ہے
رکیے میں بھی ساتھ چلوں گی
کوئی ایسا کھیل نہیں ہے
یاں، میں جس سے جی بہلاؤں
مجلس ہے کچھ جیل نہیں ہے
جو میں پابندی سے بیٹھی
سب کچھ دیکھوں اور نہ بولوں
جب میں اڑ کر جاسکتی ہوں
پھر کیوں اپنے پر نہ تولوں؟

(بیٹر، کبوتریاں، غوغائیاں اور دوسری خواتین مکرم آزاد چڑیا اور گینڈے کو جاتے ہوئے حسرت سے دیکھتی ہیں لیکن جب نر انھیں گھور کر دیکھتے ہیں تو ناک بھوں چڑھانے

لگتی ہیں۔ گینڈا اور آزاد چڑیا محفل سے چلے جاتے ہیں)

سانپ : غیر مہذّب لوگوں سے میں
عاجز ہوں لیکن کیا کیجئے؟
(گدھے پر نظر جاتی ہے جو ابھی اسی طرح کھڑا ہے)
چلیے، آپ بھی کہتے ہوں گے
جب میں کچھ کہنے لگتا ہوں
رخنہ کوئی پڑ جاتا ہے،
آپ ابھی آدم کی بابت
جانے کیا کہنے والے تھے؟

گدھا : جنابِ صدر مرا ذہن کچھ بھٹک سا گیا
میں سوچتا ہوں کہ گینڈے کی حرکتِ بے جا
ہر ایک فرد کی توہین ہے یہاں جو ہے
یہ خود سری ہے تو میں کم نہیں کسی سے یہاں؟
مجھے بھی ناز ہے، میرا بھی خون صالح ہے
وطن تھا میرے بزرگوں کا سرزمینِ حجاز
حسب نسب پہ مرے کوئی حرف لائے تو
مجھے بھی ناز ہے میں بھی ہوں آج اس کا مجاز
یہ کہہ سکوں کہ فریدوں کے اصطبل سے مجھے
ہے ایک نسبتِ دیرینہ، جدِّ امجد نے
وہاں سے ترکِ وطن جب کیا تو آئے حجاز
حجاز بھی انھیں آیا نہ راس لا جان
وہاں سے ترکِ وطن کرکے آئے ہندوستان

یہ دَور وہ ہے ابھی مغلیہ حکومت میں
گدھوں کی پوچھ تھی، عہدے، خطاب اور جاگیر
ملے تھے ہم کو بھی لیکن وہ بات آج کہاں
کمان ٹوٹ چکی، چھٹ چکا کمان سے تیر
کبھی دکھاؤں گا شجرہ میں آپ کو اپنا
مجھے بھی فخر ہے ماضی پہ اپنے میں نے بھی
عنانِ ملک سنبھالی تھی شاہزادہ ہوں
بچھڑ گیا ہوں مگر کاروانِ ماضی سے!

(یہ کہتے کہتے گدھا ایک دم ہچکیاں لے کر رونے لگتا ہے۔ سامعین میں سے ایک دو پر اور رقّت طاری ہوجاتی ہے)

سانپ : خیر، اب بیٹھیے آپ
صبر سے لیجیے کام
اور اب اس کے سوا
کچھ نہیں چارۂ کار
گردشِ لیل و نہار
ہے اسی چیز کا نام

(ایک بوڑھا ہدہد گہری سانس لے کر آنسو پونچھتے ہوئے)

ہدہد : وتُعِزّ من تشا،
وتذِلُّ من تشاء،
بیدك الخیر
اِنّك علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر

(محفل پر ایک سناٹا چھاجاتا ہے۔ ایک تاریکی جس میں سب کھوجاتے ہیں)

دوسرا رنگ

" اچھے شوہروں کی رائے ہے کہ حُسن عموماً بنجر زمین کی
مانند ہوتا ہے۔ نہایت شاداب زمینوں میں کچھ بُرے
ٹکڑے بھی نکل آتے ہیں"

(جان ڈن)

(گینڈا اُچھلتا کودتا ایک گھنے جنگل سے گزر رہا ہے چڑیا اس کے سینگ پر بیٹھی ایک رومانی گانا گا رہی ہے)

چڑیا : تم ہو اس جنگل کے راجا میں ہوں اس جنگل کی رانی
تم لاؤ کچھ دال کے دانے
میں لاؤں گی کھیت سے چاول

(گینڈا بھی چڑیا کی آواز میں آواز ملا دیتا ہے)

گینڈا : دونوں مل کر کھچڑی پکائیں
اور اکھٹے پیار سے کھائیں

چڑیا : اوہوں اوہوں اوں !

گینڈا : یہ کیوں یہ کیوں ؟

چڑیا : تم دیکھو میں کھاؤں!

گینڈا : یہ کیوں یہ کیوں؟

چڑیا : میں ہوں اس جنگل کی رانی !

گینڈا : میں ہوں اس جنگل کا راجا !

چڑیا : اس کا نام ہے الفت پیارے

عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے
دلبر کھاتا ہے اور عاشق
گن کر لقمے خوش ہوتا ہے
دلبر ہنستا ہے اور عاشق
اس کی یاد میں خوں روتا ہے
عشق میں جو گیہوں بوتا ہے
کیسی ہی شاداب زمیں ہو
گیہوں کا جَو ہو جاتا ہے !
اس کا نام ہے الفت پیارے
عشق میں سب کچھ کھو جاتا ہے
گھڑا، صراحی، کھاٹ، کھٹولی،
کرتا، دھوتی، ساری، چولی
عشق میں جاڑا، گرمی دونوں
عشق میں سختی، نرمی دونوں
رات کو تارے گنتے گنتے
دن کو پتھر چنتے چنتے
کٹ جاتی ہے جیسے تیسے
روتے یا سر دھنتے دھنتے !
اس کا نام ہے الفت پیارے
عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے

(گینڈا عشق کی یہ تعریف سن کر چڑیا کو ہوا میں اچھال دیتا ہے۔وہ گاتے گاتے اڑکر ایک پیڑ کی شاخ پر جا بیٹھتی ہے اور ایک دم چلانے لگتی ہے۔)

چڑیا : چوں چوں چوں چوں
آدم آدم آدم آدم !
(گینڈا بھاگ کر درختوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ چڑیا پتوں کی آڑ لے لیتی ہے۔ دور سے آدم آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چہرے کی سفیدی میں سرخی بہت نمایاں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے جس سے وہ کبھی کبھی فضا میں آگ اور دھواں اڑاتا جاتا ہے۔ آدم انتہائی غصہ میں ہے۔)

آدم : کہاں گئے یہ غلامانِ شورہ پشت تمام
نہ آج آگ جلی ہے، نہ ہل چلے ہیں کہیں
تمام چولھے، زمینیں، ہرے بھرے میدان
پڑے ہیں خالی نگاہوں میں اک نفس بھی نہیں
کسے پکار کے پوچھوں یہ کیا تماشا ہے
ارادہ بد نظر آتا ہے کچھ مجھے ان کا
انھیں خبر نہیں میں بحر و بر کا مالک ہوں
زمیں ہی کیا ہے میں شمس و قمر کا مالک ہوں
(آدم غضب میں آکر اپنے آلہ سے آسمان کی طرف آگ اور دھواں اڑاتا ہے۔ چڑیا درخت سے اتر کر ایک دم اس کے آلے پر آن بیٹھتی ہے)

آدم : اے سبک پرواز حسن
حسن کے غماز حسن
کیا ہوئے یہ شورہ پشت
یہ غلامانِ غلام؟
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
رک گئے ہیں میرے کام

چڑیا : سب کے سب تیرے خلاف
جوڑ کر بیٹھے ہیں سر
کہہ رہے ہیں اب ہمیں
آدمی کی ذات سے
واسطہ کوئی نہیں
اب نہیں آئیں گے ہم
اس کی باتوں میں کبھی
جان جائے یا رہے

آدم : (بگڑ کر) جب مری تخلیق پر
جھک گئے تھے سب کے سر
پھر یہ ہنگامہ ہے کیوں؟
میں سہی اک مشتِ خاک
چھیڑ سکتا ہوں وہ راگ
بھسم ہو جائے زمیں
میرے قبضے میں ہے آگ
میرے قبضے میں ہے، خیر
دیکھتا ہوں کون کون
جائے گا میرے خلاف
کون میرے حکم سے
کر سکے گا انحراف؟

(آدم جانے لگتا ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے)

آدم : میر مجلس کون ہے؟

چڑیا: میر مجلس کے لیے
سانپ سے بہتر ہے کون؟
آدم : اور واں خچر بھی ہے، کتا بھی ہے؟
چڑیا : کیوں نہیں ہیں پیش پیش!
آدم : (اطمنان کا سانس لے کر) یعنی محفل کا نظام
سب کے ذہنوں کی لگام
ان کے ہاتھوں میں ہے پھر؟
(مسکراکر ایک خاص انداز سے چڑیا کی طرف دیکھتا ہے)
اب کوئی خطرہ نہیں!
ہیں یہ سب اپنے عزیز
جن کے بل پر میں یہاں
حکمراں ہوتا ہوں، نیز
جن سے میری زندگی
بن گئی ہے کوئی چیز
میر محفل یہ ہیں گر
پھر کوئی خطرہ نہیں
(آدم سیٹی بجاتا ہوا محفل کی طرف چل دیتا ہے۔ چڑیا اڑکر پھر پیڑ پر جا بیٹھتی ہے اور گانے لگتی ہے۔ گینڈا اپنی کم مائگی پر جھلا کر زمین کھودنے لگتا ہے)
چڑیا : عشق میں جو گیہوں بوتا ہے
کیسی ہی شاداب زمیں ہو
گیہوں کا جَو ہو جاتا ہے
اس کا نام ہے الفت پیارے

عشق میں سب کچھ کھو جاتا ہے
گھڑا، صراحی، کھاٹ، کھٹولی
کرتا، دھوتی، ساری ، چولی،
(گاتے گاتے پر پھیلا کر منظر کو ڈھانپ لیتی ہے)

تیسرا رنگ

"اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ گو ایمان کا دعویٰ
کرتے ہیں مگر فی الحقیقت مبتلائے شرک ہیں۔"

(کتاب الحکمت)

(کانفرنس بدستور جاری ہے، نُجر کھڑا ہوا تقریر کررہا ہے، اس کے جسم پر ایک نہایت قیمتی جھول پڑی ہے جس پر زر و جواہر ٹنکے ہیں اور سر پر تاج نما کوئی چیز ہے۔)

نُجر : میں شاہزادہ کا مفہوم آپ لوگوں کو
بتاچکا ہوں، یہی چاہتے ہیں شاید وہ
اب اس کے بعد کوئی ساتھ دے نہ آدم کا!
شریکِ حال نہ ہو کوئی غمگسار نہ ہو
کسی بھی کام میں اس کے کوئی مدد نہ کرے
وہ خود ہی آن کے جب تک نہ یہ زباں سے کہے
کہ ہم غلام نہیں اس کے اور نہ وہ آقا!

(نُجر یہ کہہ کر ایک نظر سانپ کی طرف دیکھتا ہے۔ سانپ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہتا ہے)

نُجر : مجھے بھی کد نہیں تجویز سے کہ مجھ کو بھی
اسی زمیں سے محبّت ہے، اس کے پھولوں میں
وہی ہے رنگ، وہی بو، وہی نزاکت ہے
مجھے پسند ہے جو، پر مرے اصولوں میں
ہے ایک یہ بھی، مجھے جلد باز لوگوں سے
کوئی لگاؤ نہیں بلکہ ان سے چڑتا ہوں!

مرا خیال ہے تجویز سخت ہے یہ ذرا!
گر آپ سب کی یہی رائے ہو تو میں بدلوں؟
(بیل بیٹھا ہوا بڑے غور سے خچر کے چہرے کا جائزہ لے رہا ہے۔ خچر سانپ کے ایما پر جونہی تجویز کی سختی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بیل کھڑا ہوجاتا ہے)

بیل : کون ہے تم میں نہیں آگاہ جو
میرے دم سے کھیتیاں ہیں سبز رنگ
اس زمیں کے سینۂ معصوم سے
میرے دم سے پھوٹتی ہے وہ امنگ
جھونپڑوں میں جو ہے قوتِ لایموت
اور محلوں میں گلابی تند آب
شہر سے کوسوں پرے جینے کی آس
شہر میں ہے ماہ پاروں کا شباب
میرے کاندھوں پر نہ رکھا جائے گر
بوجھ بن کر، چوب و آہن یعنی ہل
بانجھ ہوجائے زمیں کی نرم کوکھ
خوشۂ گندم ہے اس محنت کا پھل
میں جو کرتا ہوں دہکتی دھوپ میں!
(بیل ایک لمحہ کے لیے رک کر حاضرین کے چہروں کا جائزہ لیتا ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔ خچر اور سانپ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بیل خچر سے مخاطب ہو کر)

بیل : کیا ہے اس تجویز میں سختی کی بات؟
آپ سے پوچھوں مری حالت زبوں

کیوں ہے آخر، کون ہے اس کا سبب
آپ پر چھایا ہے آدم کا فسوں!
(باقیوں سے مخاطب ہو کر)
ہے کہاں وہ چارہ سازِ زندگی؟
مجھ کو مل جائے کہیں پوچھوں گا کیوں
کس کے بل پر کارخانوں میں ہے دھوم
کیا مرا اور میرے ہم جنسوں کا خون
تیرے پرزوں میں نہیں، پھر بھی ہمیں،
ایک مٹھی گھاس دینا بھی ہے کفر
ہم زمیں کی روح لا کر دیں تجھے
اور تو بدلے میں اس کے دے ہمیں
ذلتیں جتنی بھی تجھ سے بن پڑیں
اور سمجھے ہم اسی کے اہل ہیں
اور جو تو نے لیا تیرا تھا حق
ہم کو سمجھائے کہ غربت دین ہے
اس خدائے عز و جل کی، جس نے شق
کردیے سینے پہاڑوں کے کبھی
زلزلوں سے پیٹھ اکثر توڑ دی
پیل تن پیڑوں کی، جن کی موت پر
چیخ اٹھتی ہے زمیں اور دشت و در!
(ہر طرف شور بلند ہوتا ہے)
خرگوش : یہ ظلم ہے!

ہرن : یہ جبر ہے!

خرگوش : یہ ظلم سہتے سہتے ساری زندگی گزر گئی!

ہرن : زباں سے کہتے کہتے ساری زندگی گزر گئی!

پاڑہ : ہم اس کو بیخ و بن سے کیوں اکھاڑ کر نہ پھینک دیں؟

چیتل : بہت ہوا ہم اس کی کیوں نہ دھجیاں بکھیر دیں؟

(غرض کہ پورا مجمع بپھر جاتا ہے۔ سانپ سراسیمہ ہوکر ادھرادھر دیکھتا ہے اور مجمع کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے)

سانپ : مرا خیال ہے اب کل پہ ملتوی کردیں
بہت ہوئیں یہ تقاریر آج ختم کریں؟

(کوئی سنتا ہے کوئی نہیں سنتا۔ شور برابر جاری رہتا ہے۔ سانپ جھلا کر پھنکارنے لگتا ہے)

سانپ : یہی سبب ہے غلامی کا آپ لوگوں کی
نہ تربیت ہے نہ تنظیم کوئی آپس میں
جھگڑ رہے ہیں مگر جانتا نہیں کوئی
طریقہ کیا ہے کریں کس طرح اسے بس میں
جو اپنا دشمنِ ماضی و حال و مستقبل
نہ صرف آج ہے، پہلے بھی تھا، رہے گا بھی!
ذرا تو سوچیے ہیں آپ کس قدر جاہل
جھگڑ رہے ہیں پہ تدبیر کر نہیں سکتے!
بہادروں کی کبھی موت مر نہیں سکتے!

(سانپ کے اس خطاب پر ہر طرف خاموشی چھاجاتی ہے۔ نجّر اٹھ کر سانپ کی تائید کرتا ہے)

خچر: جنابِ صدر نے جو کچھ کہا مجھے اس سے
ہے اتفاق ابھی ہم میں وہ شعور نہیں
جو لابدی ہے سیاست کی گتھیوں کے لیے
مگر وہ وقت بھی اب کوئی اتنا دور نہیں
کہ ہم میں جاگ اٹھے وہ شعورِ خوابیدہ!
مراخیال ہے آدم کا ساتھ دینا ہی
کچھ اور روز ہمارے لیے ضروری ہے
مراخیال ہے آدم کا ظلم سہنا ہی
کچھ اور روز ہمارے لیے ضروری ہے
جنابِ صدر نے جو کچھ کہا نہ صرف مجھے
مرا خیال ہے ہر اک کو اتفاق ہے یاں؟

(کتا جواب تک خاموش بیٹھا تھا موقع غنیمت جان کر اپنی کارگزاری دکھانے کی غرض سے کھڑا ہوتا ہے)

کتا: مجھے ہے تجربہ محفل کا اس کی
میں اکثر اس جگہ آیا گیا ہوں
اگرچہ بارہا ایسا ہوا ہے
کہ اس محفل سے اٹھوایا گیا ہوں
اک اتنا چاہنے پر ایک زنجیر
مجھے مل جائے ٹھکرایا گیا ہوں
مگر یہ شرط تھی زنجیر پر ہو
جلی حرفوں میں کندہ نام 'آدم'
اسی زنجیر کی خواہش میں برسوں

دیے تھے ڈالیوں کا رنگ دے کر
خود اپنے ہاتھ سے تحفے تحائف!
مرے تحفے قبول اس نے کیے بھی
مجھے زنجیر جو چاہی تھی میں نے
ملی لیکن بہت ذلّت اٹھا کر!
یہ سب کچھ ہے مگر پھر بھی کہوں گا
کہ آدم کی بقا پر ہے ہماری
بقا کا انحصار اب آپ جانیں!
مجھے معلوم ہے اس کا ارادہ
ہمیشہ نیک تھا اور آج بھی ہے
خود اس نے بارہا مجھ سے کہا ہے
ہماری سخت خواہش ہے کہ تم کو
کسی عنوان اس جنگل کا راجا
بنادیں، پر یہ مشکل ہے کہ تم میں
نہیں اک فرد بھی گدی کے قابل!

(کتا یہ کہہ کرداد طلب نگاہوں سے خچر اور سانپ کی طرف دیکھتا ہے۔ بیل جھلا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کتے سے مخاطب ہوتا ہے)

بیل : اس گھنے جنگل میں اگ آئیں اگر
تم سے احمق چند اور
زندگی بن جائے پھر
اک عذابِ مستقل
یہ ردائے آب و آتش باد و گِل

پھینک دینے کے سوا چارہ نہ ہو!
جانتا ہوں اس تمہارے رحم دِل آدم کو میں
اس کے رخساروں میں جو
سرخیاں ہیں جلوہ گر
تم سے میں پوچھوں وہ ہے کس کا لہو
اس کی آنکھوں کی چمک
اس کے چہرے کی دمک
اس کی تابانی کا راز
میری بربادی میں ہے!
تم سے گر وعدہ حکومت کا ہے، مجھ سے کیوں نہیں
مجھ سے کچھ فہم و فراست میں زیادہ تم نہیں؟
جانتا ہے وہ کہ تم
بے عمل ہو، جھوٹ سچ
دونوں یکساں ہیں تمہارے واسطے!
تم فقط زنجیر کے طالب ہو بس
ہاں فقط زنجیر!
جس پر ہو جلی حرفوں میں کندہ اس کا نام
اور میں!

(بیل اک لمحہ کے لیے رکتا ہے۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ آدم کھڑا اس کی تقریر بغور سن رہا ہے۔ بیل آدم کی طرف اشارہ کرکے)

بیل : تم سے کچھ کہنے کو آیا ہے تمہارا آقا
بڑھ کے پوچھو تو سہی جراتِ پرواز کرو

کیا خبر کہنے یہ آیا ہو کہ آزاد ہو تم
سر جھکاؤ، اٹھو تسلیم کا در باز کرو
جس پہ قائم تھے زمانے سے تمہارے اجداد
پھر انھیں لطف و عنایات کا آغاز کرو!

(بیل کے اس اشارے پر تمام جانور آدم کی طرف دیکھتے ہیں اور سہم کر رہ جاتے ہیں۔ خچر کتا اور سانپ سوچ میں ہیں کہ کیا رویہ اختیار کیا جائے)

بیل : نحیف روحو، غلام جسمو
زباں پہ کیوں پڑ گئے ہیں تالے!
ابھی تو شعلہ بنے ہوئے تھے
ابھی تو سب موت کے حوالے
کیا ہی بس چاہتے تھے خود کو؟
مجھے یہ احساس بھی نہیں تھا
کہ تم کو لفظوں کے تانے بانے
پسند ہیں اور کچھ نہیں
پسند ہیں اور کچھ نہیں ہیں
پسند ہیں تم کو وہ فسانے
جنھیں سنانے سے نیند آئے
مگر لہو چاہتی ہے وہ شے!

(آدم اپنا آلہ اٹھا کر بیل کی طرف آگ اُڑاتا ہے، بیل زخمی ہو جاتا ہے)

بیل : (زخمی ہو کر) مگر لہو چاہتی ہے وہ شے!
جو تم یونہی مانگنے چلے ہو!

(تمام جانور آدم کی اس حرکت پر بگڑ جاتے ہیں)

خرگوش : ظلم کا بانی ہے یہ!

ہرن : ہڈیاں اس کی کچل دو پیس ڈالو اس کا سر!

پاڑہ : بوٹیاں اس کی کھلا دو چیل کوّوں کو ابھی

چیتل: خون کا بدلہ ہے خون!

خرگوش : انتقام اب انتقام!

(تمام جانور مل کر آدم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں کہ یکایک فضا میں ایک نعرۂ مستانہ گونجتا ہے)

نعرہ : ہری اوم تت ست، ہری اوم تت ست ، ہری اوم تت ست

(عملی قدم رک جاتا ہے۔ سب اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کتے کے ایما سے آدم بھاگ کر درختوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ فضا میں ایک اور نعرہ گونجتا ہے)

نعرہ : ہری اوم شو شو شو شو شو!

(جس پیڑ پر بندر بیٹھا تھا اسی پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر آنکھیں بند کئے الو بیٹھا ہے ۔چوں کہ وہ پرندوں کی دنیا کا درویش مانا جاتا ہے، اس لیے بظاہر ہر چیز سے بیگانہ نظر آتا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو گدھ بیٹھے ہیں۔ عملی قدم اٹھتے دیکھ کر الو کشت وخون کا تصور کر کے خوف خداوندی سے کانپ جاتا ہے اور پکارتا ہے)

الو : ہری اوم تت ست، ہری اوم تت ست ۔ ہری اوم تت ست

پہلا گدھ: ہری اوم شو شو شو شو شو!

(دوسرا گدھ جس کی کلغی پہلے کی نسبت زیادہ زرد ہے)

دوسرا گدھ : سنو سنو بولے مہاراج! سنو سنو بولے مہاراج!

(ہرطرف خاموشی چھاجاتی ہے۔سانپ اپنی جگہ سے تھوڑا ہٹتے ہوئے)

سانپ : حضور اس جگہ تشریف لائیں جائے صدر
ہمیشہ خالی ہے، جب آپ سے بزرگ یہاں
ہمارے سر پہ ہیں سایہ فگن تو پھر کیا غم؟

مگر یہ بے ادبی ہے کہ مجھ سے نالائق
یہاں پہ صدر ہوں بیٹھے رہیں حضور وہاں!

پہلا گدھ: پرندوں کی دنیا کے درویش ہیں یہ
انھیں واسطہ ہی نہیں ہے کسی سے!

دوسرا گدھ: یہی بہت ہے میاں، تم ہی سے سعادت مند
جہاں میں پھولتے پھلتے ہیں پر حضور ابھی
تکلفات کے قائل نہیں سیاست میں!
یہ چاہتے ہیں کہ تم نوجوان جب بھی کبھی
قدم اٹھاؤ کوئی ان سے پوچھ لو پہلے
یہ چاہتے ہیں سیاست کے ساتھ دھرم رہے!

(سانپ اور گدھ دونوں الّو کی طرف دیکھتے ہیں، الّو آنکھیں کھول کر ایک بار دور شمالی افق کو دیکھتا ہے جدھر سے آریہ لوگ ہندوستان آئے تھے)

الّو: ہری اوم تت ست، ہری اوم تت ست، ہری اوم تت ست
شانتی شانتی شانتی شانتی شانتی !!!

سب: ہری اوم شانتی شانتی شانتی شانتی شانتی !!!

الّو: مری تو رائے یہی ہے کہ آپ سب حضرات
تمام اپنی شکایات اور گلے شکوے
نہتے ہو کے، ابھی قوتِ حیات و نمو
کے پاس لے کے پہنچ جائیں اور پکاریں تو
اماں میں اپنی جگہ دے کہ اب نہیں کوئی
جسے ہم اپنا کہیں، کوئی کارساز نہیں
ترے سوا، تو ہی ہم مفلسوں کی دولت ہے

ہمارا آسرا تو ہی ہے ایک دین دیال!
ہمارے پاس فقط تو ہے اور کچھ بھی نہیں
ہمیں سنبھال کہ دشمن کی اور کوئی چال
ہماری راہ سے ہم کو نہ اب ہٹا پائے!

(الّو یہ کہہ کر ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوجاتا ہے اور جذب وکیف کے عالم میں پکارتا ہے)

الّو : ہری اوم شانتی شانتی شانتی شانتی!!

سب : ہری اوم شانتی شانتی شانتی شانتی!!!

گدھ : شِو شِو شانتی شانتی شانتی شانتی!!!

الّو : ہری اوم تت ست، ہری اوم شانتی!

سب : ہری اوم تت ست، ہری اوم شانتی!

الّو : شانتی شانتی شانتی شانتی !!

سب : شانتی شانتی شانتی شانتی !!!

ہری اوم تت ست، ہری اوم شانتی!!!

(تمام جانو 'ہری اوم شانتی' کا ورد کرتے ہوئے قوتِ حیات ونمو کے دربار کی طرف چل دیتے ہیں۔ الّو سب کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور پہلے کی طرح پھر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ آدم درخت کے پیچھے قہقہہ لگاتا ہے جو تمام فضا پر چھا جاتا ہے)

چوتھا رنگ

"مجھے کتوں نے گھیر لیا ہے۔ شیطنت نے احاطہ کرلیا ہے۔
میرے ہاتھ اور پاؤں گھائل ہوگئے ہیں۔ میرے رفیق مجھے
ان کتوں سے رہائی دلوا"

(انجیل مقدس)

(سطحِ زمین سے کچھ اونچائی پر ایک بہت بڑا دروازہ ہے جو آسمان تک بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ دروازے کے دائیں بائیں جو دیوار اس سے ملحق ہے حدِ نظر تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ تمام جانور دروازے کے سامنے سر بہ سجود ہیں۔ زخمی بیل مناجات کررہا ہے)

بیل : اے خالق ہر عیش و غم و ظلمت و ہر نور
اے غائب و حاضر تری تخلیق کا ہر رنگ
پائندہ ہے اور ہم کو ہے مرغوب بھی لیکن
چھٹتا نہیں امید کے رخسار سے کیوں زنگ؟
اے مالک ہر الفت و نفرت، تری دھرتی
کیا کچھ نہیں کرتی ہے تھکے ہاروں کی خاطر
سایہ کبھی دیتی ہے کبھی گود میں لے کر
وہ نیند سُلاتی ہے تھپک کر کہ کبھی پھر
جاگا ہی نہیں خواب سے سو درد کا مارا!
دیتی ہے کبھی تشنہ لبوں کو وہ سہارا
جو چشمۂ شیریں ہے کبھی اور کبھی ظلمات
جو دن ہے کبھی اور کبھی بدمست و سیہ رات

اے خالقِ ہر عشرتِ دو روزہ ترا فیض
جاری ہے کہیں پھول کہیں خار میں اکثر
لیکن یہی کیوں ہے کہ ہمیں ملنے نہ پایا
اک لمحہ بھی فرصت کا، رہی جنگ برابر
آفات سماوی، کبھی ارضی سے ابھی تک!
جیتے رہے لیکن تری مرضی سے ابھی تک!
ہر زخم کا مرہم ترا موہوم تصور
ہر خواب کی تعبیر ترا وعدۂ فردا
وہ وعدۂ فردا جو ہمارا تہی داماں
پھولوں کی تمنا تھی اگر اک گراں سودا
بھر دیتا، اگر ہم پہ عنایت ہی تھی مقصود،
کانٹوں سے، ہمیں یہ بھی گوارا تھا مگر کیوں
محروم کیا ہم کو ہر اک چیز سے معبود!
کہتی ہے، مرا ایک دیا ہے سو بجھادوں
یہ سانپ یہ خنجر یہ تری خلقتِ معصوم
پھر تجھ سے کہوں میری مدد کر کہ نہیں اور
میں جس سے مدد مانگنے جاؤں، ہے تری دھوم
اے خالقِ اقلیم غم و حسرت و آلام
ہر گام پہ یہ کس نے بچھائے ہیں کئی دام؟
تو حکم کرے اے غمِ ہستی کے خداوند
شعلہ جو رگ و پے میں تڑپتا ہے بجھادوں
اور تیرے تصور سے فروزاں کروں راہیں

تو حکم کرے میں وہ تمنائیں جگادوں
جو دفن ہیں ماضی کی کسی قبر کہن میں؟

(دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔تمام جانور بیل کی معیت میں اندر چلے جاتے ہیں۔ دروازہ پھر بند ہوجاتا ہے۔ اندر دروازے کے قریب کی تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر باقی پانی ہی پانی ہے۔ پانی کے درمیان کنول کا پھول تیر رہا ہے۔پھول کے درمیانی حصہ میں روشنی سی ہے۔ غالباً یہی قوت حیات و نمو کا ظہور ہے۔ معاً پھول کو حرکت ہوتی ہے اور ایک آواز فضا میں گونجتی ہے)

قوت : تاریک زمیں کو ہم نے بخشے مہ و مہر
ندیوں کو لطیف راگ، دریا کو خرام
ہر بحر کو گوہر دیئے گوہر کو جلا
کلیوں کو مہک گلوں کو خاموش کلام
تاروں سے فلک سجائے، پھولوں سے زمیں
سبزہ کو نکھار بخشا ذرّوں کو دمک
شبنم کو لطیف روح، پتھر کو چمک
پتوں کو ردائے سبز، شاخوں کو لچک
جسموں کے کنوارپن کو بھینی خوشبو
بن چھوئی زمیں کو حُسنِ تخلیق و نمو!

بیل : تری محبت سے خالقِ کل
نہ پہلے انکار تھا نہ اب ہے
مگر جہاں اسقدر کیا تھا
وہاں پہ بختِ رسا بھی دیتا
ہمیں تو چاروں طرف نہیں کچھ

سوا اندھیرے کے سوجھتا، گو
زمیں بھی روشن ہے آسماں بھی!

قوت: قصور کس کا ہے یہ ہمارا؟

بیل: توکس نے بخشا ہے بختِ خفتہ؟

(قوت یہ سن کر خاموش ہوجاتی ہے۔ خاموشی میں اظہارِ ناراضگی کے انداز ہیں۔
سب جانور سہم کر رہ جاتے ہیں)

قوت: (ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد)
ہمیں یہ محسوس ہورہا ہے
کہ تم اشاروں پہ دوسروں کے
ہمیشہ چلتے رہے ہو گرچہ
تمہیں بھی بخشی تھی عقل ہم نے!

بیل: ہمیشہ ان پر عمل کیا ہے
جو تیرے فرمان تھے زمیں پر
اسی پہ قانع رہے جو بخشا
کبھی نہ آئی شکن جبیں پر

قوت: اسی قناعت کا ہے نتیجہ
کہ تم نے اوروں کو سونپ دی ہے
حکومت اور مملکت زمیں کی!
انھیں سے پھر مستعار لی ہے
وہ عقل جو راہبر نہیں ہے
اسی قناعت نے تم کو رکھا
حضور میں ان کے جو نہیں ہیں

تمھارے ہمدرد اور کہیں کیا!

بیل : خدائے عالم بلند و برتر
یہ بھید کیا کھل رہے ہیں ہم پر
جو تیرے فرمان تھے زمیں پر
انھیں پہ چلتے رہے برابر
کبھی اطاعت سے منھ نہ موڑا
کبھی نہ چاہا کہ ہم ہوں خودسر
ہماری حالت خراب تر تھی
مگر ترا نام تھا زباں پر!

(قوت ایک دم بگڑ جاتی ہے)

قوت : فضول باتوں میں وقت کھو کر
ہمیں کو شرمندہ کر رہے ہو
ہمارے احکام کو نہ سمجھا
تمام عمر، آج بھر رہے ہو
مگر یہ عالم ہے گمرہی کا
کہ بے سبب ہی بپھر رہے ہو!
ہمارا فرماں ہے یہ زمیں پر
کہ سانپ کتوں کے سامنے تم
جھکاؤ سر اور کچھ نہ بولو؟
کہ خنجروں کے جہاں پہ ہوں سم
وہاں تمہاری جبیں ہو اور بس
تمہارا آقا ہے ایک آدم

تم آپ آپس میں کچھ نہیں ہو؟
تمہاری ہستی ہے اور سو غم
زمیں تمہاری نہ آسماں ہے؟
تمھیں نہیں حق کہ سانس بھی لو
بغیر مرضی کے دوسروں کی؟
تمہارا جنگل میں حشر جو ہو
زباں پہ اک حرف بھی نہ آئے
کوئی نہ لب تک کبھی ہلائے؟

بیل : یہ سانپ کتّے یہ تیرے گُرگ
تمام ہیں برگزیدہ بندے
تری زمیں کے ترے جہاں کے
ہمارے جنگل کے سب پرندے
درند اور چرند سب ہی
سمجھ رہے ہیں کہ تونے ان کو
زمیں پہ بھیجا ہے اس لیے ہی
کہ ہم پہ حاکم ہوں اور جو بھی
اٹھائے سر اس کو زیر کر کے
جو تیرے فرمان ہیں زمیں پر
سزائیں دے کر کہیں کہ مانو
خدائے عالم بلند و برتر؟

قوت: ہماری توہین ہے کہ تم پر
نہیں کھلے راز بھی زمیں کے؟

یہ اور حیرت کی بات ہے تم
نہ جان پائے کہ آستیں کے
جو سانپ ہیں ان سے کیسے بچ کر
تلاش کی جائے رہ خوشی کی!
ہمارا فرماں تو یہ نہیں ہے
کہ تم غلامی ہی دوسروں کی
کرو گے اور کچھ نہ کرسکو گے

(بیل تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں ڈوب جاتا ہے پھر سر اٹھا کر گویا ہوتا ہے)

بیل : میں شرمندہ ہوں اپنی کاہلی پر
خدائے مہر و ماہ و آب و ہر رنگ
مگر معلوم ہے تجھ کو حقیقت
کہ مجھ پر ہیں زمیں کی وسعتیں تنگ
مجھے فرصت نہیں ہل کھینچنے سے
جہاں تک میں سمجھتا ہوں خردمند
ہیں اس پر متفق میری نظر سے
ہر اک شئے دور رکھیں، مجھ کو پابند!
میں ناواقف ہوں اپنے کیف و کم سے
میں ناواقف ہوں میرے گرد اور پیش
ہے کیا کچھ، کوئی بتلاتا نہیں بیش؟
جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہنرور
ہیں اس پر متفق میری نگاہیں
کسی عنوان تاریکی سے باہر

کبھی جانے نہ پائیں، روشنی کا
مزہ میں چکھ نہ پاؤں اور تڑپ کر
انھیں پابندیوں میں جان دے دوں
میں شرمندہ ہوں اپنی کاہلی پر
خدائے مہر و ماہ و آب و ہر رنگ
مجھے خود چاہیے تھا میں جھپٹ کر
اندھیرے سے اجالا چھین لیتا!
(قوت کی خاموشی میں اطمنان کی جھلک ہے)

قوت:　سنو تو اک بات اور سن لو
تمہارے غم کا سبب نہیں ہے
وہ چیز آدم ہے نام جس کا
کہیں ہے شعلہ دھواں کہیں ہے

بیل:　تو پھر ہے کون اے خدائے راحت؟

قوت:　یہ سانپ خچر ہی پاگلو سب
تمہارے امراض کا سبب ہیں!
(سانپ اور خچر وغیرہ سہم کر رہ جاتے ہیں)

قوت:　نہیں تو کیا تھی مجالِ آدم
کہ تم پہ اور حکمران ہوتا
یہ کتے خچر. یہ سانپ ہیں سب
تمہارے ناسور ان سے بھاگو
یہی تو ہیں جن کے بل پہ آدم
لہو سے تم سب کے کھیلتا ہے

(اچانک دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

قوت: کون ؟ کون؟

آواز: میں ہوں آدم!

(قوت کے اشارہ پر دروازہ کھل جاتا ہے)

قوت: ہر شئے کے غلام
تم ہو آؤ!

(دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ آدم داخل ہو کر)

آدم: آقا کہیے!

قوت: آقا کس کے

آدم: یہ وسعتِ کائنات
ذرّے خورشید!
چڑھتا ہوا چاند ڈھلتی ہوئی شام
چشموں کے لطیف راگ، ندیوں کا خرام
کھلتے ہوئے رنگ، نکھری ہوئی خاک
مہکے ہوئے برگ و بار، یہ رگِ تاک
پیمانہ خمارِ جاودان و پیہم کے امیں
ریشم سے بدن کے نرم گرم شرمیلے حسیں
پھیلے ہوئے سبزہ زار
سب چرند پرند!
آقا ہوں میں ان کا
اے خدائے نمو!
اے خدائے جمال!!

اے خدائے حیات!!!

قوّت: آقا ہو تم ان کے؟

آدم : اے خدائے حیات!

(قوّت یہ سُن کر قہقہہ لگاتی ہے جو ہر چیز پر چھا جاتا ہے)

اختتامیہ

(مکان و زمان ایک دم نگاہوں کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں)

مکان : کتنے رنگ ابھر سکتے ہیں اس تاریکی کے پردے سے
جس میں کھو جانے والوں نے اب تک اپنی راہ نہ پائی
بھٹکے بھٹکے پھرتے ہیں سب اس دھرتی کی کھوج میں جس کا
وعدہ اب تک ہے وعدہ ہی جس کی ایک جھلک شیدائی
دیکھ نہ پائے اور زمیں نے لاکھوں بھید اکٹھے کر کے
ان سب کا اک بھید بنایا اور کہا لے کر انگڑائی!

زمان : تاریکی میں چلنے والو امیدوں کے دیے جلاؤ
ہولے ہولے چلتے جاؤ منزل آنے ہی والی ہے
دیکھو ایک کرن لہرائی اُس بدلی کے پیچھے دیکھو
یہ بدلی بھی دھیرے دھیرے اب چھٹ جانے ہی والی ہے

مکان : اس بدلی کے چھٹتے چھٹتے اور تماشے بھی کچھ ہوں گے
اب تک ہم نے کیا ہی کیا ہے اور تماشے بھی دیکھیں گے
رنگ اڑیں گے پورب پچھم ہلکے ہلکے گہرے گہرے
بہتا خون بھڑکتے شعلے اور شرارے بھی دیکھیں گے

(زمان و مکان یہ کہہ کر پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور جنگل ایک ۱۰
اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے)

فصل ۳

گرداب کے بعد کی ایک نظم، (۱۹۴۸)

(یہ نظم صرف آب جُو اور سرو ساماں میں شامل ہے)

پَل پَل رُوپ بھرے

پَل پَل بدلے رنگ یہ ناری، پَل پَل رنگ بھرے
کبھی اندھیری رات میں آ کر جھوٹے دیے جلائے
کبھی کبھی اپنے آنچل سے جلتے دیے بجھائے
کبھی لیے پلکوں میں آنسو میٹھے بھید بتائے
بات بات پر کبھی لبوں سے کڑوا رس ٹپکائے
دن سے رات کرے
آپ ہی بیٹھی گڑھے کھلونے آپ ہی توڑ کے روئے
آپ ہی سوگ منائے اس کا جو کچھ آپ ہی کھوئے
آپ بگولے کاٹے تھک کر آپ ہوائیں بوئے
آپ بچھائے راہ میں کانٹے آپ ہی ان پر سوئے
الٹی بات کرے
آپ ہی اپنا روپ سنوارے آپ ہی جان سے جائے
آپ ہی اپنے پیچھے بھاگے آپ ہی ہاتھ نہ آئے
آپ ہی اپنے رنگ سے کھیلے آپ ہی پھر شرمائے
آپ ہی اپنا بھید بتا کر پھر پیچھے پچھتائے
جیت سے مات کرے
پَل پَل بدلے رنگ یہ ناری پَل پَل روپ بھرے

فصل ۴

تاریک سیّارہ، اشاعت ۱۹۵۲

زُلفیہ کے نام جو-- جو اِس تاریک سیارہ کی مخلوق نہیں!

(اخترالایمان شادی سے پہلے سلطانہ ایمان کو زلفیہ کہہ کر بلاتے تھے)

مطبوعہ: نیا ادارہ، لاہور

(یہ کتاب ادارہ ترقی اردو، حیدرآباد نے بھی چھاپی ہے۔ کتاب پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے)

آبادی

بگولے اٹھتے تھے عنوانِ خاک و باد لیے
نہ شورِ بزمِ طرب تھا، نہ دَورِ شمعِ جمال
زمیں کے سینہ سوزاں پہ کوئی بار نہ تھا
بہارِ یاسمن و لالہ کا شکار نہ تھا

کہیں سے آئے بگولوں کے ساتھ خانہ بدوش
نگاہ سوز جوانی نے کاروبار کیا
بنائے رنگ محل استخوان و اعضاء پر
بہارِ یاسمن و لالہ کو شکار کیا
سرودِ نالہ اٹھا رقصِ ناتواں کے لیے
چھلکتے جاموں نے رندوں کا انتظار کیا

لہو تڑپ کے مچلنے لگا شبستاں میں
ہوا کسی کو محبت کا امتحاں مقصود
تفنگ و تیر کی منزل پہ آیا عشق خموش
خمار بڑھنے لگا مستیاں شکار ہوئیں
دہل بجا تو حدودِ مکاں شکار ہوئیں

غبارِ راہ بنا کارواں کا سرمایہ
فضائے دشت میں پھیلا ہوا تھا رنگِ ملال
بگولے اٹھتے تھے عنوانِ خاک و باد لیے
نہ شورِ بزمِ طرب تھا، نہ دورِ شمعِ جمال

جبر

زرد پتوں کا وہی ڈھیر وہی دورِ خزاں
خشک شاخیں ہیں ابھی منتظرِ فصلِ بہار
مرگِ انبوہ سے کچھ کم تو نہیں ہے یہ سماں
کتنا جاں کاہ تسلسل ہے، وہی لیل و نہار

اس قدر ناز نہ کر پھول سے رخساروں پر
زندگی بھیک ہے جو جبرِ مشیت سے ملی
حُسنِ بے مایہ مِلا تجھ کو، مجھے تشنہ دِلی
ہم بھکاری ہیں، بھکاری کی حقیقت کیا ہے!
ایک کشکولِ گدایانہ لیے پھرتے ہیں
منظرِ عام پہ، ویرانوں میں، آبادی میں
سب ہی بے بس ہیں، سبھی ہونٹ سیے پھرتے ہیں

اپنی مجبوری کا شاید تجھے احساس نہیں
ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج، یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے
اشک چھن جائیں، نگاہوں سے حرارت چھن جائے
ظلم پروردہ جوانی سے محبت چھن جائے

حُسن ایک ٹیس کی صورت میں بدل کر رہ جائے
ظلمتِ یاس میں اک آہ مچل کر رہ جائے

پس منظر

کس کی یاد چمک اٹھی ہے، دُھندلے خاکے ہوئے اجاگر
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں تنہا بیٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ ہڈّی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پر دُھندلے دُھندلے نام کھدے ہیں، میں جیون بھر
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر
مستقبل اور حال کو چھوڑے، دُکھ سُکھ سب میں لیے پھرا ہوں
ماضی کی گھنگھور گھٹا میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے، دُھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟
بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں، ہوک سی بن کر ایک اک مورت
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں، دُور کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں، "گزرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے، ہر جانی پہچانی صورت
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں، کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دِل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دِل سے سارے رشتے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل اِن رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے!

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے درد کے، جس کو
اپنی رُوح سمجھ کر اب تک لیے لیے پھرتا تھا ہر سُو
لیکن آج اُڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو
جس میں آنسو بوئے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں، جو ہو
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے، جو رہ جائے وہ اپنا لوں

اعتراف

چند لمحے جو ترے ساتھ گزارے ہیں نے
ان کی یاد، ان کا تصور ابھی رخشندہ نہیں
تو ابھی چھائی نہیں مجھ پہ، مری دنیا پر
خود ترا حُسن مرے ذہن میں تابندہ نہیں
کیا خبر کل مجھے یکسر ہی بدل ڈالے تو
یوں ترا حُسن، مرا شوق ابھی پائندہ نہیں
دیکھ میں ہوش میں ہوں اے غمِ گیتی کے شعور
تیرے ملنے کی تمنا لیے آنکھوں میں کہاں
اپنے ظلمت کدے اے جان سنوارے میں نے
غم چشیدہ مرے جذبات میں وہ جذبِ نہاں
اب کہاں پہلے گزاریں کئی راتیں میں نے
جن میں افسانے کہے، چاند سے افسانے سنے
اب کہاں، پہلے، برس گزرے کسی مہوش کی
چاہ میں، کتنے ہی ہنگامِ سحر گیت بُنے!
اب مگر تاب کہاں مجھ میں، یہ انگور کی بیل
خون چاہے گی، رگ و پے میں سما جائے گی
میں تجھے کیسے جگاؤں گا کہ بیدار ہے تو
ہاں تری یاد مرے ذہن پہ چھا جائے گی

اب میں اس نشہ سے گھبرانے لگا ہوں اے جاں
روح معصوم ہے ٹھوکر کوئی کھا جائے گی!

وہ تری گود ہو یا قبر کی تاریکی ہو
اب مجھے نیند کی خواہش ہے، سو آجائے گی!

انجان

تم ہو کس بَن کی پھلواری اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو، میں کیا جانوں میں ہوں کون

چلتا پھرتا آپہنچا ہوں، راہی ہوں، متوالا ہوں
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا روپ سجایا ہے
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا کھیل رچایا ہے
ان گیتوں کا جن کی دُھن پر ناچ رہے ہیں میرے پران
ان لہروں کا جن کی رَو میں ڈوب گیا ہے میرا مان

میرا روگ مٹانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون

میں ہوں ایسا راہی جس نے دیس دیس کی آہوں کو
لے لے کر پروان چڑھایا اور رسیلے گیت بُنے
چھتے چھتے جگ کے آنسو اپنے دیپ بجھا ڈالے
میں ہوں وہ دیوانہ جس نے پھول لٹائے خار چنے!
میرے گیتوں اور پھولوں کا رس بھی سوکھ گیا تھا آج
میرے دیپ اندھیرا بن کر روک رہے تھے میرے کاج

میری جوت جگانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون؟

ایک گھڑی اک پَل بھی سُکھ کا امرت ہے اس راہی کو
جیون جس کا بیت گیا ہو کانٹوں پر چلتے چلتے
سب کچھ پایا پیار کی ٹھنڈی چھاؤں جو پائی دنیا میں
اس نے جس کی بیت گئی ہو برسوں سے جلتے جلتے

میرا درد بٹانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو، میں کیا جانوں میں ہوں کون

جب اور اب

کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت میں گدگدی سی تھی لوریوں کی
نئی نئی کونپلوں کی نرمی، نئے شگوفوں کی تازگی تھی
کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت تھی گیت اُٹھتی جوانیوں کا
کہاں یہ دن ہے کہ تیری آواز بن گئی ہے صدائے صحرا
نہ جانے کس گوشہ زمیں سے رُکی رُکی سی، تھمی تھمی سی
گھٹی گھٹی سی ہزار پردوں سے آج چھن چھن کے آ رہی ہے!

اتفاق

دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہو ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گزر
جہاں ہجومِ گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے!

اجنبی

تو ہے کچّی کونپل اب تک جس کے لوچ میں پیار ہی پیار
اور میں گرمی سردی چکھے ڈالی پر اک تنہا پات
تو سچّا موتی، میں ہیرا، پھرا جو برسوں ہاتھوں ہاتھ
تو اوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات
تو تاروں کے نُور کی دھارا، میں گہرا نیلا آکاش
میں ہوں جیسے ٹوٹا نشہ، تو ہے جیسے شاخِ نبات
تو ہے ایک ایسی شہنائی جس کی دُھن پر ناچے مَوت
تیری دنیا جیت ہی جیت ہے، میری دنیا؟ چھوڑ یہ بات!
تو ہے ایک پہیلی جس کو جو بوجھے وہ جان سے جائے
تو ہے ایسی مٹی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان
آ میں تیرا انگ بھی چھودوں، چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات
میں نے وہ سرحد چھولی ہے، جہاں امر ہوجائیں پران
اے آنکھوں میں کھبنے والی جانے کون کہاں رہ جائے
جیون کی اس ڈور میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان
لیکن اے سپنوں کی مایا تو چاہے تو روگ مٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس دوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان

عہدِ وفا

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشم نم ہو، یہاں اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی، جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا، بیٹی،
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو، مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھاکر
وہ کہنے لگی میرا ساتھی 'اُدھر' اس نے انگلی اٹھاکر بتایا، اُدھر اس طرف ہی
(جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں)
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں راؔئی

تبدیلی

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سر پھرے"
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سُنیں اور کہیں
اور اِس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رُخ موڑ لے!

سجدہ

سیاہ رات بس اب ٹوٹنے ہی والی ہے!
ہوا ہی چاہتا ہے دامن و گریباں چاک
اس آفتابِ سرِ آسمانِ الفت کا
مِلا ہی چاہتا ہے بے قراریوں کو سکوں
کھلا ہی چاہتا ہے آبلوں پہ رنگِ حنا

خطِ اُفق پہ ابھی تیرگی ہے تھوڑی سی!
سیاہ پردے نگاہوں سے اٹھے جاتے ہیں
غبار سا تھا سرِ راہ، وہ بھی کچھ کم ہے
وہ سُرخ سُرخ شفق لے رہی ہے انگڑائی
یہ میری آنکھ خدا جانے آج کیوں نم ہے؟

لہو پکار ہی دے گا شہیدِ منزل کا
تھکی ہوئی تھیں نگاہیں، پناہ چاہی تھی
اِسی گھڑی کا، اِسی دن کا انتظار بھی تھا
کوئی شریر کرن بڑھ کے چُوم ہی لے گی
جبینِ شوق میں اک سجدہ بے قرار بھی تھا!

تعمیر

میں بھی تعمیر اک جہان کروں!
بستیاں چند، غم کے مارے چند
مہ و خورشید اور تارے چند
ٹوٹنے والے ہوں سہارے چند

روشنی تیرگی میں کھو جائے
زندگی روتے روتے سو جائے
یہ حکایت دراز ہو جائے

بے کسی کا چراغ جلتا ہو
مَوت کے غم سے جی بہلتا ہو
رہگذاروں میں خوں مچلتا ہو

آسماں سے ہو کلفتوں کا نزول
لوٹ آئے دعا خموش و ملول
کھلنے پائے کبھی نہ بابِ قبول
میں بھی تعمیر اک جہان کروں!

واپسی

خاموش ہے، گنگ ہے، سیہ پوش
ماضی کے محل کی کہنہ دیوار
ٹوٹا نہیں بے حسی کا پندار
چھوڑا تھا اسی محل کے پیچھے
احباب کو صرف نغمہ و ساز
رکھتے تھے شرارتوں کی بنیاد
ہوتا تھا محبتوں کا آغاز
لوٹا ہوں تو محفلیں ہیں خاموش
آتی نہیں قہقہوں کی آواز
زنداں کی حدوں میں کھو گئے ہیں
دیوانے بہل کے سو گئے ہیں
دروازوں پہ دے رہا ہوں آواز
خاموش ہے گنگ ہے سیہ پوش
ماضی کے محل کی کہنہ دیوار
پھیلائے ہوئے زمیں ہے آغوش
تاریکی میں ڈھونڈتا ہوں راہیں
سورج کو ترس گئیں نگاہیں!

دستک

کھٹکھٹاتا ہے درِ خفتہ کوئی!
انتظار، اشک، گماں، کچھ بھی نہیں
شمع، پروانے، دھواں، کچھ بھی نہیں

سوچ لوں باز کروں در، نہ کروں
شیشہ و سنگ کی جھنکار سنوں
آج کیا کہتے ہیں غم خوار سنوں

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا

قیامت

بارگاہِ لا فانی
بے خبر ہے جانے کیوں؟
ایک اشکِ بے مایہ
معتبر ہے جانے کیوں؟

ہم نفس دعا مانگیں
"روشنی کے مینارے
ماہ و آسماں، تارے
ٹوٹ کر بکھر جائیں
کوہ و دشت و دریا سے
کانپتی صدا اٹھے
اے خدائے لا فانی
مختصر جہانبانی

مدتوں کی تاریکی
روشنی سے دُھل جائے
چشمۂ بقا پھوٹے

آسمانِ تازہ پر
آفتاب تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
مَوت کا جنازہ ہو!

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسمِ خاکی
یہ سیم گوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیل گوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حُسنِ بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے
جوان، دِل کش، حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی
کُھلی ہوئی بد نصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں

اور آخرش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی

اسی لیے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے، یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سُلادیں؟

شکوہ

خدائے عالم، بلند و برتر
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
محبتوں کے لطیف دامن
مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں
یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں
نئے شگوفے، نئی بہاریں
فرازِ کوہِ گراں سے گرتی
ہیں تند اور تیز آبشاریں
مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر میں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رلا کر
خدائے عالم، بلند و برتر!
نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے ساتھ مر سکوں میں؟

پہلی کرن

"صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی"
تاروں بھری حسین رات، نرم رواں جوان شام
کھوئی ہوئی سی اک ہنسی، بھولا ہوا سا اک خرام
مَوت کی وادیوں میں گُم ہو گئی پھر وہ نغمگی
فرشِ زمیں پہ خار و خس پرتوِ خور سے جاگ اٹھے
شعلہ و دود جاگ اٹھے، آہن و سنگ جاگ اٹھے
رنج و الم کے شاہکار، لے کے امنگ جاگ اٹھے
جاگ اٹھے ہیں قہقہے، تیز، بلند قہقہے
رات کی خواب گاہ میں بجھ گئے شب چراغ پھر
پہلی کرن کے ساتھ ساتھ جاگ اٹھے دِل کے داغ پھر!

تجھے گماں ہے

تجھے گماں ہے مری محبت ترے کرم سے جواں ہے شاید
مری جوانی، تری جوانی کی بے رخی کا شکار ہو گی
مرا لہو، میرے اشک بن کر، سیاہ راتوں کی نذر ہو گا
یہ وسعتِ کائنات شاید حکایتِ انتظار ہو گی

مرے لبوں پر سلگ رہا ہے طویل زلفوں کا ایک بوسہ
ترے تبسّم کی یاد باقی ہے، زہر کے گھونٹ پی رہا ہوں
مرے تخیّل کی تنگ دنیا ترے تصوّر سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تری تمنّا میں جی رہا ہوں

تجھی سے سیکھا ہے میرے نغموں نے سنگ و آہن کو موم کرنا
ترے لبوں کی شگفتگی سے ہی میرے شعروں میں تازگی ہے
تری ہی پُرکار سادگی سے مرے جہاں میں ہے حشر برپا
ترے ہی دِل کش حسین چہرے سے میری، آنکھوں میں روشنی ہے

یہ شورشِ غم، جنونِ پیہم، مرے لیے کچھ نئے نہیں ہیں
تجھے گُماں ہے گزر رہا ہوں میں تیری الفت کے امتحاں سے
تجھے مری سخت کوش فطرت سے، جانِ غم، آگہی نہیں ہے
تجھے گماں ہے کہ اب نہ شاید میں اُٹھ سکوں تیرے آستاں سے

تری محبّت بھری نگاہوں کی دِل کشی بھولتا نہیں ہوں
مگر ترا آستاں نہ چھوٹے، گماں ہے، میں نقشِ پا نہیں ہوں!

سلسلے ٹوٹ گئے...

اٹھ گیا رات کے چہرے سے ستاروں کا کفن
سبزہ و گُل پہ ابھی تک ہے وہی پہلا نکھار
صبح کی آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے خمار
دن کے ہمراہ چلا قافلۂ رنگ و بہار
سینۂ خاک پہ رقصاں ہے وہی رُوحِ حیات
وہی کلیوں کی خموشی، وہی غنچوں کا ثبات
نورِ خورشید سے ذرّوں کی جبیں روشن ہے
دشت و کہسار میں ہے پھر وہی کرنوں کا خرام
پھر وہی شور، وہی کشمکشِ دانہ و دام
پھر اُسی مرکزِ آلام پہ لوٹ آیا ہوں
پھر وہی حُسن سے حیوان کی چارہ جوئی
پھر وہ انسان سے انسان کی چارہ جوئی
سلسلے ٹوٹ گئے خواب کی زنجیروں کے
مری پلکوں پہ ستارے سے لرز کر ٹوٹے
اس کے ہونٹوں پہ سہارے سے لرز کر ٹوٹے

تجدید

ایک بار پہلے بھی نغمہ بار تھیں شاخیں
برگ و بار آئے تھے، نخل پھول لایا تھا
لد گئی تھی پھولوں سے خاکِ بے سر و ساماں
ایک بار پہلے بھی میں نے گھر سجایا تھا

ایک بار پہلے بھی قافلے بہاروں کے
اوڑھ کر ردائے گُل اِس طرف سے گزرے تھے

آپ ہی نہ جانے کیوں بجھ گئے دیے گھر کے
ایک شعلۂ غم سے خاک ہو گئی محفل
نیشِ خار پھولوں کے دِل میں چُبھ گیا جا کر
قافلے بہاروں کے لُٹ گئے سرِ منزل

ایک بار پہلے بھی تیرگی کے دامن میں
مرگِ نغمہ و گُل پر آنسوؤں سے کھیلا ہوں!

آج تم نے پھر آ کر سب دیے جلائے ہیں
غمکدے کی دیواریں جگمگا اٹھی ہیں پھر!

پس و پیش

خلش ہے مرگِ تبسّم کی میرے پہلو میں
جلو میں رفتہ بہاروں کو لے کے آئی خزاں
کوئی نہیں بھری دنیا میں ہم نفس میرا
وہ راہ رو ہوں جسے ہر قدم پہ ہے یہ گماں
یہ سنگِ میل کہیں سنگِ رہ نہ بن جائے
کہیں فریب نہ ہو شوقِ منزلِ جاناں
کہیں نہ ظلمتِ شب گھیر لے سرِ منزل
سیاہ رات نہیں میرے درد کا درماں!
میں ارضِ لالہ و گل چھوڑ تو نہیں آیا
یہ خار زار نہ ہو جس کی سمت لپکا ہوں!
ہر ایک گام پہ یہ سوچ کر سنبھلتا ہوں
یہ راہِ مرگ نہ ہو اور تو بے خبر رہرو
متاعِ یک نفسِ سوختہ بھی کھو بیٹھے
جلا نہ دے ترے ہونٹوں کو آتشِ گلِ نو؟

تاریک سیارہ
(ایک کشمکش)

حریف اول: خواب

حریف دوم: حقیقت

"جان من حجلۂ تاریک سے نکلو، دیکھو
کتنا دِل کش ہے یہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کے مانند حسیں
خُلد میں دودھ کی اک نہر سی ہے کاہکشاں"

"آسماں خود ہی نگوں سر ہے اسے کیا دیکھوں
رات کے پاس ہے کیا مرگِ تبسّم کے سوا
جس کے ذرّوں میں ہے اب تک مرے ماضی کا لہو
میں نے باندھا ہے اسی خاک سے پیمانِ وفا!"

"دن کے وامانده، اسی دامن شب میں اکثر
اپنی منزل کے حسیں خواب میں کھو جاتے ہیں
یا کسی سادۂ و پُرکار کی میٹھی یادیں
اپنے پہلو میں دبائے ہوئے سو جاتے ہیں"

"میں بھی کھیلا ہوں تصور سے کسی کے برسوں
میں بھی اک حلقۂ صد رنگ کا زندانی تھا
اب مگر چاہتا ہوں ورطۂ شب سے نکلوں
وہ بھی دن تھے کہ کوئی وجہِ پریشانی تھا"

رات کے پاس ستارے بھی ہیں سیارے بھی
دامنِ شب میں اندھیرا ہی نہیں نور بھی ہے
ایک سیارہ محبت کی نئی دنیا ہے
جس میں ایمن بھی ہے موسیٰ بھی ہے اور طور بھی ہے"

"آسماں دور ہے، نزدیک ہے یہ تودۂ خاک
جس کی آغوش میں ہیں رنگ کے چشمے رقصاں
جس میں ہے نکہتِ گُل، بوئے سمن، بادِ نسیم
جس میں ہیں سبزۂ و شبنم کے فسانے غلطاں!

"ہر نفس جس میں ہے پابندِ غمِ دورِ خزاں
صبح کی آنکھ میں اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
قسمتِ حُسن ہے رسوائی ہر دو عالم
کائنات عشق کی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں؟"

"اور وہ سیارے جو ہیں میری نظر سے اوجھل
ان میں کیا سلسلۂ کشتی و طوفان نہیں؟
شیشہ و سنگ نہیں، شعلہ و شبنم بھی نہیں
تم یہ کہتے ہو کہ اس دنیا میں انسان نہیں؟"

"میری نظروں سے نہاں راز ہیں اب تک اس کے
اتنا معلوم ہے خوشیاں ہیں وہاں مستِ خرام
حُسن و موسیقی نے اک جال سا بُن رکھا ہے
سایۂ گُل میں کوئی ہوگا مگر دست بجام"

"جی کو بہلایا فسانوں کا سہارا لے کر
خواب میں زلف و رخِ جان تمنا دیکھا
آتشِ گُل سے جلا ڈالے اندھیرے میں چراغ
ڈوبنے والوں نے کشتی کا تماشا دیکھا"

"ہر نَفس خواب ہے ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا، نہ ماضی ہے نہ حال
آج ماضی ہے وہی دوَر، جو فردا تھا کبھی
مَوت ملتی ہے تمناؤں کے چہرے پہ گلال"!

"جو سمجھتے ہیں حقیقت کو فقط نقشِ خیال
تم بھی ہو، اور بھی ہیں، ایک ہے انبوہِ کثیر
جو ابھی تک ہے پسِ پردۂ تاریکیِ شب
جو ابھی تک ہے زمیں چھوڑ کے تاروں کا اسیر"

"خاکداں تیرہ و تاریک ہے شمعیں بے نور
اس اندھیرے میں یہ کہتے ہو ستاروں سے نہ کھیل
میں اسے خواب نہیں بلکہ حقیقت سمجھوں
مجھ سے یہ کہتے ہو نادیدہ بہاروں سے نہ کھیل"

"ساحلِ بحر پہ تسکین، خذف ریزوں سے
وادیٔ مرگ میں نادیدہ بہاروں کی لگن؟
یہ اگر زادِ سفر ہے تو مسافر کے لیے
بالشِ خاک پہ بہتر ہے ستاروں کا کفن!"

"اور کیا ظلم و جہالت کے درِ دولت پر
پڑ رہوں خاک بسر، ناصیہ فرسائی کروں؟
چھوڑ کر دامنِ سیارۂ و ماہ و انجم
حُسنِ مغرور کے قدموں پہ جبیں سائی کروں؟"

"آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو!
سب اسی ارضِ سیہ بخت کی خاطر ہیں یہ کھیل
خاک پروردہ نظاروں کی طرف دیکھو تو!"

"چند مرجھائی ہوئی کلیاں ہیں مَسلے ہوئے پھول
درد سامان بہاروں کی طرف کیا دیکھوں؟
جو پلے ظلمت و اندوہ کے گہوارے میں
ان نظر سوز نظاروں کی طرف کیا دیکھوں؟"

"ظلمتِ خاک میں پوشیدہ ہے آبِ حیواں
قسمتِ سوختہ ساماں ہے بدلنے ہی کو رنگ
اور کچھ دیر لہو ہو لے دلِ خانہ خراب
محفلِ درد سے اٹھنے ہی کو ہے نغمۂ چنگ"

"پھر تصور نے تراشی ہے پنہ گاہ نئی
تودۂ خاک ہے کیا سامنے سیاروں کے
زندگی اب تو حنائے سر ناخن بھی نہیں
مَوت لَو دینے لگی چہرے پہ بیماروں کے"

"آسماں دُور ہے اب خواب گراں سے اٹھیے
ظلمتِ شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن
اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرۂ و تار!"

دُور کی آواز

نقرئی گھنٹیاں سی بجتی ہیں
دھیمی آواز میرے کانوں میں
دُور سے آ رہی ہے تم شاید
بھولے بسرے ہوئے زمانوں میں
اپنی میری شکایتیں شکوے
یاد کر کر کے ہنس رہی ہو کہیں

خاک و خون

(ایک مکالمہ)

کردار :- قوتِ نمو، راہی

(خون خاک میں جذب ہو جاتا ہے اور شگوفہ بہار بن کر پھوٹتا ہے۔ تاریک سیارے کے ہر تودۂ خاک میں اس بہار آفریں مستقبل کی قوتِ نمو ہے، جو نئی انسانیت کی تمہید بنی رہتی ہے۔)

"کیا ہوئی آپ کی وہ گرمیٔ گفتار و نگہہ
اب نہ پہلی سی وہ باتیں ہیں نہ افسانہ کوئی
قہقہے سوگ میں ڈوبے ہوئے، آنکھیں مغموم
جیسے صحرا سے چلا آتا ہو دیوانہ کوئی"

"وہ تھکا ہارا ہوں میں جس کو ہے سورج کی تلاش
مجھ سے یہ تیرگیٔ شب نہیں دیکھی جاتی
پھول مرجھائے ہوئے، ڈالیاں بے برگ و ثمر
سرنگوں شاخ کوئی اب نہیں دیکھی جاتی"

"پر اسی تیرگیٔ شب میں ستارے بھی تو ہیں
میں تو ہلکی سی کرن لے کے بھی جی لیتی ہوں
اس مسرّت کے سہارے پہ جو آئے گی کبھی
کتنے ہی تلخ ہوں آنسو، انھیں پی لیتی ہوں"

"جگنوؤں ہی سے اندھیرے میں بہل جاتی ہو
مَوت پھیلائے ہوئے راہ میں ہے دام ابھی
ساتھ دے سکتے ہیں کب تک یہ سہارے، یہ خیال
آدمی پوج رہا ہے وہی اصنام ابھی"

"مَوت بڑھتی ہوئی طاقت سے نہیں لڑ سکتی
تیز دریا کی روانی میں خس و خاک کبھی
کتنی یورش کریں دیوار نہیں بن سکتے
آپ ہوں، میں نہیں انسان سے مایوس ابھی"

"مجھ کو دنیا کے خم و پیچ کا اندازہ ہے
جس کی بنیاد میں خوں ہے وہی تعمیر ہے یہ
جس کی دیوار ہی کج ہو وہ محل کچھ بھی نہیں
آدمی ہی کی تراشی ہوئی تقصیر ہے یہ"

"آپ کیا جانیے اس وہم سے کب نکلیں گے؟
منتظر راہ گذر، حُسنِ شفق، نقشِ بہار
کتنے تسکین کے سامان ہیں آنکھوں کے لیے
دلِ بیتاب یہ کہتا ہے انھیں بڑھ کے پکار"

"اک بدلتے ہوئے رنگوں کا تلاطم ہے یہ سب
جن کی قیمت اسی انسان نے اتنی دی ہے
جونہی آنکھیں ادھر اٹھتی ہیں کہ بھر آتی ہیں!
ایک فریاد ہے جو روح نے اکثر کی ہے"

اور یہ زرد سے دانے جو شگوفوں کو لیے
پردۂ خاک سے آجاتے ہیں بالائے زمیں
شبنمی سبز لبادوں سے مہک دیتے ہوئے
ان کی قوّت کا بھی کیا آپ کو اقرار نہیں؟

"سب خزاؤں کی امانت ہیں یہ نوزائیدہ کھیل
یہ شگوفے، یہ گُل و لالہ و نسرینِ چمن
صبح ہنستی ہوئی آتی ہے بہاروں کو لیے
شام روتی ہوئی جاتی ہے لیے گردِ محن"

"آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے، ابھی کم سن ہے بہار
شبنمی، سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک و خوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار؟"

جب آنکھ کھلی تو......

(چار تصویریں: کھیل، زخم، وسوسہ، راہگذر)

(۱)

جب آنکھ کھُلی تو موسمِ گل
پھولوں کی زباں میں اک کہانی
ہر برگ و شجر سے کہہ رہا تھا
مقصود تھی دِل کی ترجمانی
چہروں سے سرک رہے تھے آنچل
مصروف تھی کھیل میں جوانی
ہر عضو سے پھوٹتے تھے نغمے
آنکھوں سے شراب ڈھل رہی تھی
جسموں سے ابھر رہی تھیں تانیں
ہر پہلو میں آگ جل رہی تھی

جب آنکھ کھُلی تو موسمِ گُل
رنگوں کی گھلاوٹوں میں گم تھا!

(۲)

چھاگل سے اُٹھی جو تان غم کی
آنکھوں سے لہو کی دھار پھوٹی
سینے میں دھواں سا پیچ کھا کر

اس طرح اٹھا کہ آس ٹوٹی
سر جھک گیا، داغ مسکرائے
تاریکی میں پھلجھڑی سی چھوٹی
وہ قوسِ قزح، وہ دستِ رنگیں
کیا جانے سمٹ کے رہ گئے کیوں
اک سیم گوں رات میں نہ جانے
آنسو، آنکھوں سے بہہ گئے کیوں؟

میں تھا کہ بھٹک رہا تھا ہر سُو
ہر خواب سلگ رہا تھا دِل میں

(۳)

اک وہم سے بیش تھا نہ کچھ بھی
ساحل تھا نگاہ میں، نہ طوفاں
ہر چیز تھی رنگ و بو سے خالی
صحرا، کہسار اور گلستاں
میں خود ہی تھا رنج و غم کا خالق
میں خود ہی تھا دست در گریباں
ہر چیز میں رنگ بھر رہا تھا
میں خود کو فریب دے رہا تھا
میں خود سے الجھ رہا تھا اب تک
خشکی ہی میں ناؤ کھے رہا تھا

پھر خواب سے چونک اٹھا سنبھل کر
ہر شے تھی حقیقتِ مجسّم

(۴)

مغموم تھا وقت راہ مسدود
چھائے ہوئے تھے سیاہ بادل
ہر نغمہ خموش ہو چکا تھا
پاؤں سے الجھ چکی تھی چھاگل
کمھلائے ہوئے تھے دستِ رنگیں
چہروں سے سرک چلے تھے آنچل
اک اور ہی سمت تھیں نگاہیں
آنکھوں سے خیال بہہ گئے تھے
تاباں تھی افق پہ خون کی لو
اوہام سُلگ کے رہ گئے تھے

تاروں کے سہارے چل رہے تھے
سورج کی تلاش میں تھے راہی

اعتماد

بولی خود سر ہوا ایک ذرّہ ہے تُو
یوں اڑا دوں گی میں، موجِ دریا بڑھی
بولی میرے لیے ایک تنکا ہے تُو
یوں بہا دوں گی میں، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا، میں سلیمان ہوں
ابنِ آدم ہوں میں، یعنی انسان ہوں

ایک کہانی

کردار :-

ماضی (حزنیہ کورس)

آدمی

محبوبہ

باغی

باغیوں کا گروہ -۱

باغیوں کا گروہ -۲

مستقبل

محل وقوع : تاریک سیارے کا ایک ملک

زمانہ : حال

تماشائی : من و تو

ماضی : کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

آدمی:- رنگ و نور کی موجیں جس میں
رات کے بندھن توڑ چکی تھیں
ٹوٹ چکے تھے ظلم کے پھندے
پیار کے ناتے جوڑ چکی تھیں
جب تھی دنیا تاریکی میں

اس دھرتی پر سورج چمکا
دودھ کی دھاریں رس کی بوندیں
پی پی کر ہر پتّہ جاگا

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

محبوبہ:- سب دھرتی کے بیٹے مِل کر
گیت محبّت کے گاتے تھے
اَوروں کا سُکھ اپنا سُکھ تھا
اَور کی آگ میں جل جاتے تھے
تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر
دھرتی ماں کا پیار جگاتے
جگمگ جگمگ کرتے دن میں
اپنی محنت کا پھل کھاتے
الفت کے بھوکے تھے سارے
خون کے پیاسے کیونکر ہوتے
جھوٹ اور لوبھ کا سودا کر کے
کیسے خود آرام سے سوتے
دھن دولت تھا، پیار کی باتیں
اپنے دن تھے، اپنی راتیں

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا !

محبوبہ:- دریا، جھرنوں اور چشموں سے
ہلکے ہلکے راگ اُبلتے
جب سورج کی کرنیں پڑتیں
پھول اور کلیاں آنکھیں ملتے
میٹھی میٹھی نیند سے اٹھتے
دن جاتا اور رات کا راجا
نور کی کشتی لے کر آتا،
"چندا ماموں گیت سنا جا"
سب کہتے، وہ پیار لٹاتا
دن کا سندیسہ دیتا جاتا

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

(افق میں اک شور پیدا ہوتا ہے چیخیں بلند ہو کر دب جاتی ہیں)

آدمی:- ہری بھری کھیتی کا دشمن
اک پاپی باہر سے آیا
پیار کے رشتے ناتے توڑے
اس نے مَوت کا کھیل رچایا
آگ کی مدھم آنچ بڑھا کر
گھر پھونکے، ہنستوں کو رُلایا
ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوا میں

زہر ملایا، خون بہایا
لوہے کی زنجیریں ڈھالیں
نفرت کے پھل پھول لگائے
سچ پر جھوٹ، خوشی پر غم نے
اپنے اپنے تیر چلائے

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا !

محبوبہ:- مَوت کا تحفہ لے کر آئے
باہر سے پاپی بیوپاری
ہار گئے الفت کے گاہک
مات ہوئے جیون کے پجاری
پیار بھری مٹی سے پھوٹے
آگ کے شعلے خون کے دھارے
ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوا میں
ناچے نفرت کے انگارے
رات ہوئی اور تاریکی میں
مَوت کے ظالم بازو پھیلے
سناٹے میں چیخ سی گونجی
ابھرے سائے تھے میلے سے

ماضی :- کچھ بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا !

(ہر طرف ایک سناٹا چھا جاتا ہے)

آدمی:- موت کے شہپر گونج رہے تھے
رات اندھیری طوفانی تھی
نور کے بازو کانپ رہے تھے
راہ نئی اور انجانی تھی

محبوبہ:- اک باغی نے مشعل لے کر
مدّت کے مُردوں کو جگایا
آنے والے دن کا سندیسہ
لے کر قبرستان میں آیا

(رات کی تاریکی میں مشعل آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے اور قریب آتی جاتی ہے)

باغی:- اٹھو، نیند کے ماتو جاگو!
رات نے دن کو گھیر لیا ہے
دھرتی ماں کے بیٹو جاگو!
ماں نے تم کو یاد کیا ہے
اس کی روح امر ہے لیکن
تم کو آج امر ہونا ہے
خون کی ہولی کھیل کے سونا
سکھ کی نیند اگر سونا ہے

پیاسی مٹی دیکھ رہی ہے
اس پر جیون رس برسا دو
رنگ رنگ کے پھول کھلیں گے
سوئے ہوئے پودوں کو جگا دو
خون تمہارا رنگ لائے گا!
رات گئی اب دن آئے گا!

(مشعل نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے)

آدمی:۔ آگ اور خون کے فتنے جاگے
اور وہ نفرت کے بیوپاری
مَوت کا راگ سناتے اٹھے
جاگ اٹھے جیون کے پجاری
پھر پیاسوں کی پیاس بجھانے
سچ اور پیار کی جوت جگانے

(پس منظر سے ایک ساتھ بہت سی مشعلیں ابھرتی ہیں۔ باغی کی آواز کے ساتھ اور بہت سی آوازیں ہیں)

باغیوں کا گروہ:- رات گئی، اب دن آئے گا!
جاگ اٹھے ہیں نیند کے ماتے
مَوت کے دروازے سے گزرو
آزادی کا گیت سناتے

ابھی نہیں...

ابھی نہیں، ابھی منزل ہزار کوس ہے دور
یہ ولولے، یہ مسرت، یہ ناتمام امنگ
یہ آب و رنگ سے بھرپور جام، نغمۂ چنگ
بہت ملیں گے ابھی رہ میں چشمہ ہائے سرور!

ٹھہر ٹھہر دلِ مضطر یہ ننگ و نام نہ کھو
جنونِ شوق کا کم بخت، احترام نہ کھو
ہزار لالہ و گل سنگِ راہ بن جائیں
ہزار جسمِ فسوں گر نگاہ بن جائیں
ہزار پاؤں مسافت کے بار سے ہوں چور
ابھی نہیں، ابھی منزل ہزار کوس ہے دور

طلوعِ صبح سے لے نور شامِ غم کے لیے
غروبِ شام کی تاریکیوں سے ہو نہ ملول
ابھی فضا میں حلاوت نہیں ہے، تلخی ہے
ابھی کھلا نہیں انسان پر وہ بابِ قبول
جہانِ تیرہ میں برسے جہاں سے رنگ و نور
ابھی نہیں، ابھی منزل ہزار کوس ہے دور!

ایک پرتو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لیے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی محوِ خواب ہوں گی وہ سُرمگیں غم فروز آنکھیں
ہر اک شجر سو گیا، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہر اک شاخِ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں بانہیں
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریبِ صبحِ بہار کھا کر!
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیل سے ایک پرتو اُبھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تمنا سے کھیلتی ہیں تال ہو کر
یہ شب کی حسرت بدوش مستی جو چھوڑ دیتی ہے آزما کر
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے!
حسیں امیدوں کا یہ طلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے!

سکون

نہ زہر خند لبوں پر، نہ آنکھ میں آنسو
نہ زخمہائے دروں کو ہے جستجوئے مآل
نہ تیرگی کا تلاطم، نہ سیلِ رنگ و نور
نہ خار زارِ تمنا میں گمرہی کا خیال
نہ آتشِ گل لالہ کا داغ سینے میں
نہ شورشِ غمِ پنہاں، نہ آرزوئے وصال
نہ اشتیاق، نہ حیرت، نہ اضطراب، نہ سوگ
سکوتِ شام میں کھوئی ہوئی کہانی کا
طویل رات کی تنہائیاں نہیں بے رنگ
ابھی ہوا نہیں شاید لہو جوانی کا

حیات و موت کی حد میں ہیں ولولے چپ چاپ
گزر رہے ہیں دبے پاؤں قافلے چپ چاپ

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہوگی وہ شامِ کیف آگیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رخ پہ، تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اک سہانی سی
مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے، دِلوں کے سرمائے
نہ سنگِ میل نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی
ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے ذرّے
بھٹک رہے تھے بگولہ سے رہ نما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں، نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دِل میں کبھی شوقِ بے کراں لے کر
چلے تھے بارِ زمیں سوئے آسماں لے کر

دِلوں کا درد، نگاہوں کا سوز کام آیا
"دیارِ ہو" میں لبوں پر کسی کا نام آیا!
یہ کاروبار، یہ محفل، یہ ریگ زار، یہ دھوم
سرودِ نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں
صدائیں کھوئی ہوئیں وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں حل کردہ رنگِ شام کہیں
حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اس وقت آسرا نہ ہوئے
میں استخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا
"دیارِ ہو" میں پریشاں خیال، آوارا
اسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے
اِس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھنکارا
پھر ایک شام ترے حسنِ لازوال کی خیر!
صدائیں آئیں ادھر آ ترے مآل کی خیر!
پھر ایک بار تصوّر کے رنگ محلوں میں
ہجوم شوق ہوا، شورِ ناؤ نوش ہوا
دیے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے
حیاتِ رفتہ کا افسانہ بارِ گوش ہوا
تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم رُبا نغمے
بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے
سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سُو
مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے

خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑایا میں
کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے
بڑھایا دستِ تمنا کہ دامنِ امید
کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھٹ جائے

تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں
بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں!

نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں، نہ وہ شب و روز
کبھی سمٹتی کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود
ٹھہر گئی ہے اک ایسے مقام پر دنیا
جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ بے کلی نہ جمود!

پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں
ہر ایک شئے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود
میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائیں
خزاں بدوش بہاریں، خمارِ زہر آلود!

پکار

کیا خبر تابِ گفتگو نہ رہے
آ یہ لمحات پھر نہ آئیں گے
سانس لیتے میں چونک اٹھتا ہوں
رشتے نازک ہیں، ٹوٹ جائیں گے
دن ڈھلا، شام ہے اُداس اُداس
ایک منزل تو ختم ہو ہی گئی!
ایک موہوم راحتوں کی امید
تھک کے آغوشِ غم میں سو ہی گئی
ٹوٹ جائے گا یہ طلسمِ نظر
رنگ تاروں کا چھوٹ جائے گا
فرصتیں کم ہیں وقت بیتے پر
کون آئے گا، کون جائے گا؟

گردِ سفر کا دامن پھیلا . . .

بیٹھ گیا ہوں راہ گذر پر
گردِ سفر کا دامن پھیلا
ہونٹ ہیں پیاسے، بانہیں خالی
تارِ نظر ہے میلا میلا

دیکھ انسانوں کے رکھوالے
ڈھال رہے ہیں زنجیریں سی
چکپے چکپے خونی قلمیں
کھینچ رہی ہیں تصویریں سی

بے بس ذرّے کانپ رہے ہیں
روند دیا ہے تو نے ان کو
ایک نظر تو دیکھ پلٹ کر
دِل کوئی نہ ٹوٹ گیا ہو

سرِ راہگذارے

شبِ ماہ تُو ہے سحر بھی تُو
کہ فغاں بھی تُو ہے اثر بھی تُو
یہ تیری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنھیں حُسن سے بھی لگاؤ ہے
جنھیں زندگی بھی عزیز ہے!

پندرہ اگست

یہی دن ہے جس کے لیے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں
یہی سیلِ آب بقا، چشمہ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ؟
اسی کے لیے وہ سہانے مدھر، رس بھرے گیت گائے تھے میں نے
یہی ماہ وش نشئہ حسن سے چور، بھرپور، مخمور ہے وہ؟
سنا تھا نگاہوں پہ وہ قیدِ آدابِ محفل نہیں اب
وہ پابندیاں دیدۂ و دِل پہ جو تھیں اٹھی جا رہی ہیں
وہ مجبوریاں اٹھ گئیں، ولولے راہ پانے لگے مسکرانے لگے اب
محبت کٹھن راستوں سے گزر کر لہکتی مہکتی ہوئی آ رہی ہے

وہی کس مپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیِ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے

شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

آزادی کے بعد

(۱)

کہاں تو لہو تھا تصوّر ہی سے دِل
مجھے ٹوٹنے والے تاروں کا غم تھا
کبھی نا دمیدہ شگوفوں کا ماتم
کبھی سوختہ لالہ زاروں کا غم تھا
کبھی بانجھ دھرتی میں بوتا تھا آنسو
کبھی نافریدہ بہاروں کا غم تھا
کوئی جن کی بھینی مہک چھین لے گا
کبھی مجھ کو ان گُل عذاروں کا غم تھا
ٹھہرتا جنازہ کہاں رنگ و بُو کا
کبھی اپنے ہی غم گساروں کا غم تھا
کہاں نشتر باد و باراں سے ڈر تھا
کہ نو رستہ پھولوں کو گھائل نہ کر دے
کہاں پنبہ در گوش، مبہوت، پتھر
قدم خون آغشتہ مٹی میں گاڑے
کھڑا دیکھتا ہوں وہ نو رستہ پودے
وہ نا آفریدہ بہاریں، شگوفے
وہ مہکی ہوئی سی دُلہن بوستاں کی
زمیں نے سنواری تھی جس کی جوانی

اسے اپنی آغوش میں لے رہی ہے
محبت کی ماری کفن دے رہی ہے

(۲)

نہیں فرصتِ یک نگہ آدمی کو
'سیاست' کے بوئے ہوئے بیج پھوٹے
بزرگوں کی بوئی ہوئی فصل پکّی
اشارہ ملا اور 'مزدور' چھُوٹے
نہ اجرت کی پروا، نہ خدشہ صلے کا
'درانتی' کی ذد میں ہے ہر ایک پَودا
زمیں اتنی زرخیز، میدان شاداب!
یہاں بھی نہ پروان چڑھتا یہ پَودا
یہاں بھی نہ پھلتے جو یہ بیج آخر
کہاں کی زمیں راس آتی انھیں پھر!
شب و روز بس کھیتیاں کٹ رہی ہیں
کہ ڈھانچوں کے خوشوں سے دھرتی پٹی ہے
بجیں شادیانے، منَیں رنگ رلیاں!

(۳)

اٹھو ساکنانِ تہہ ارضِ اسفل
ابھی تک نہ جانے ہو کس نشہ میں چُور

سنو، آسماں بوس شہرت کے مینار
ہر اک قریہ و شہر ہے جن سے معمور
دِلوں کی کثافت کو دھو ڈالتا ہے
جہاں سے سدا پھوٹ کر چشمۂ نور
تمھارے، مرے رہنما اور خداوند
بلاتے ہیں ہم سب کو با چشمِ پُر نم
ہمارے سروں پر رہے ان کا سایہ
ہمیں اپنا، ان کو زمانے کا ہے غم
انھیں کے توسّل سے ہم سگ برادر
بھری بستیاں، پارۂ استخواں پر
کھنڈر میں بدل ڈالنا سیکھتے ہیں
انھیں کا کرم ہے کہ ہم فتنہ پرور
ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے

اٹھو ساکنانِ تہہ ارضِ اسفل
وہ شہرت کے مینار پھر جگمگائے
فضاؤں میں پاکیزہ آواز گونجی
ہمارے خداؤں کی، سر کو جھکائے
ہمیں کیا، شجر اور حجر سُن رہے ہیں
خداوند، مینار سے مسکرائے
اٹھو اپنے چنگال و دنداں کو دیکھو
اگر اب نہ چمکے تو کس کام آئے!

(۴)

بہائم نے تہذیب کی پوستینیں
جو لادے چلے آئے تھے پھینک دی ہیں
تمدن پہ فرماں ہے جنگل کا نافذ
محبت نے آنکھیں ابھی بند کی ہیں
ابھی نیند آئی ہے انسانیت کو!
یہ کہگل جو اس خون مٹی سے مِل کر
بنی، کس عمارت کی بنیاد ہوگی
وہ دھرتی جہاں آگ بوئی گئی ہے
ہوئی بھی تو کس طرح آباد ہوگی
یہ خونیں کہانی جو لکھی گئی ہے
مجھے یاد ہے، کل کسے یاد ہوگی

(۵)

سوا نیزے پر آگیا آج سورج
لیے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے
گنہ گار حیران و ششدر کھڑے ہیں
کہ اندھے ہیں سب، کون گرتوں کو تھامے
عجب نفسی نفسی ہے، پیشانیوں میں
ہیں پیوست آنکھیں، سب اپنے پرائے
اجالے کی تاریکیوں سے ہیں نالاں

مگر کون، کس کو، غمِ دِل سنائے
ابلتے ہیں سر، ہانڈیاں پک رہی ہیں

(۶)

سنو اے خداؤں کے محبوب بندو
بہایا ہے جن کی محبت میں تم نے
لہو، جسم یوں کاٹ ڈالے کہ جیسے
کوئی سوکھے پیڑوں کے بن کاٹ ڈالے!
وہ ناقوس اور گھنٹیاں مندروں کی
وہ مغموم اور دُکھ بھری داستانیں
تعاقب میں دوڑی چلی آرہی ہیں
فضاؤں میں تھرّا رہی ہیں اذانیں!

(۷)

صنم ساز و اصنام روتے ہیں تم کو
یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو
تمھارے قلم نے رنگے ہیں، انھیں کیوں
ہمارے لیے چھوڑ کر جا رہے ہو؟
یہ بارِ گراں ساتھ لے جاؤ اپنے!

یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو
تمھارے قلم نے رنگے ہیں مسلسل

لہو بن کے تڑپیں گے اُن کی رگوں میں
جو آئیں گی نسلیں، یہ بد ذائقہ پھل
جسے اتنی محنت سے بویا ہے تم نے
تمھارے جگر بند، اولاد ان کی
اور اولاد ان کی، کفن سر سے باندھے
مزاروں کے سائے میں کھاتی رہے گی!

(۸)

مہک آئی آلودہ خوں پیرہن کی
مجھے اپنے دامن میں لے ماں، اندھیرا
مری سمت بڑھتا چلا آ رہا ہے
مرے بھائی جن پر بھروسہ کیا تھا
چھپائے ہوئے آستینوں میں خنجر
مجھے پیار سے لوریاں دے رہے ہیں!

(۹)

گلوں سے الجھتی ہوئی شوخ کرنو
نئے نرم پودوں کی معصوم رُوحو!
یہاں سے ذرا اور آہستہ گزرو
وہ درماندہ شاعر جسے آدمی نے
کئی بار چاہا کہ مایوس کر دے
تمھارے لیے ہی جو تڑپا ہے برسوں

تمھاری اسی روز کی رہگذر میں
اس دامنِ خاک میں سو رہا ہے!

غلام رُوحوں کا کارواں

غلام رُوحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے

اٹھو تمدن کے پاسبانو
تمھارے آقاؤں کی زمیں سے
اُبل چکے زندگی کے چشمے
نشان سجدوں کے اب جبیں سے
مٹاؤ، دیکھو چھپا نہ لے وہ
لہو ٹپکتا ہے آستیں سے

غلام رُوحوں کے کارواں میں
نفس کی آواز بھی نہیں ہے

اٹھو، محبّت کے پاسبانو
یہ کوہ و صحرا، یہ دشت و دریا
تمھارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں پہ وہ آتشیں ترانہ
جو گرمئ بزم تھا مگر اب
گزر گیا اس کو اک زمانہ

سمندِ ایّام برق پا ہے
اٹھو، کہ تاریخ ہر ورق پر
تمھارا شبھ نام ڈھونڈتی ہے
نہ دیں گے آواز اس کے شہپر
جو وقت اڑتا چلا گیا ہے
زمین آنکھوں سے مت کریدو!
نہ مِل سکیں گی وہ ہڈّیاں جو
زمیں کا تاریک گہرا سینہ
نگل چکا ہے، نیا قرینہ
سِکھاؤ پامال زندگی کو

اٹھو مزاروں کے پاسبانو
چلو نہ گرماؤ زندگی کو
یہ ڈھیر سُونے پڑے ہیں، ان پر
کہیں سے دو پھول ہی چڑھا دو!

پیمبرِ گُل

فسانۂ گُلِ رنگیں قبا و نغمۂ شوق
طویل ڈھلتی ہوئی رات، انتظار کے گیت
تڑپ کی آگ میں جلتے ہوئے زمان و مکاں
مئے نشاط میں بھٹکے ہوئے خمار کے گیت
مزہ نہ دیں گے ابھی، ان کو احتیاط سے چھیڑ
خزاں نصیب ابھی تک ہیں کچھ بہار کے گیت

فسانۂ گُلِ رنگیں قبا نہ چھیڑ ابھی
حکایتِ بُتِ سیمیں عذار رہنے دے
نگاہ و دِل پہ مرا اختیار رہنے دے
الم نصیب جنوں سو گیا، نہ چھیڑ ابھی
نہ پا سکے گا جو میں کھو گیا، نہ چھیڑ ابھی
گزرنے والا اِدھر سے ہے اک پیمبرِ گُل
جلو میں اپنی لیے قافلے بہاروں کے
سکوں نواز، حسیں گیت چاند تاروں کے
لطیف چُھٹتے ہوئے رنگ آبشاروں کے
نفس سے جس کے مہک جائیں گے خس و خاشاک
نگہ پہ بار نہ گزرے گا جلوۂ بے باک
زمیں کی شام کو ہم رنگِ صبح کر دے گا

بھکاریوں کی تہی جھولیوں کو بھر دے گا
اُسی پیمبرِ گل کا ہے انتظار مجھے
نہ جانے کب سے سرِ رہگذار بیٹھا ہوں
برس گزر گئے، امیدوار بیٹھا ہوں
وہ آئے گا ابھی اتنا ہے اعتبار مجھے
نگہ سے کھیلتی ہے مرگِ نغمہ ہائے شوق
خزاں کی یورشِ پیہم کا رنگ دیکھ چکا
زمیں پٹی ہوئی پھولوں کی زرد لاشوں سے
کہاں کہاں ہوئی گھائل امنگ، دیکھ چکا
لیے لیے پھرا اک بار اپنے کاندھوں پر
وبالِ دوش ہوا سر کہ سنگ دیکھ چکا

لہو لہان امیدیں، جنوں کا دامن چاک
شریکِ حال کوئی تھا تو دیدۂ نمناک

ستم زدوں کو نویدِ بہار دے گا کوئی
اس اعتبار پہ جینے کی آرزو بھی ہوئی
بگڑ چکے جو مقدر سنوار دے گا کوئی
اک اس خیال سے اس دن کی آرزو بھی ہوئی
طلوع ہوگا کہیں سے جب آفتاب نیا
زمیں سے پھوٹ پڑیں گے شگوفہ ہائے رنگ
نئے نہال، نئی کونپلیں، نئے پھل پھول

نگارِ صبح کے ہنگامہ ہائے شوخ و شنگ
جو زیر خاک ہیں پودے انھیں جگائیں گے
یہ نرم ہاتھ جونہی ان کو گدگدائیں گے
وہ آنکھ ملتے ہوئے لیں گے ایک انگڑائی
ہزار ناز سے پھر ایک سبز پیراہن
پہن کے، نیست سے آئیں گے زندگی کی طرف
اندھیری گود سے معصوم روشنی کی طرف
یہ راگ بکھرے ہوئے دور تک فضاؤں میں
یہ گرد و پیش کہیں گھنگروؤں کی سی آواز
یہ رنگ سمٹے ہوئے زیر دامنِ گلِ نو
یہ رقص بھونروں کا ہر سمت، یہ چمن کا ساز
مہک اڑی ہوئی غنچوں کے نرم ہونٹوں سے
گلوں کے چھلکے ہوئے جام کا لطیف خمار
سمیٹتا ہوں انھیں اپنے تنگ دامن میں
کہ دینے آئے گا جس وقت وہ پیامِ بہار
لٹاؤں گا انھیں اس وقت اس کے قدموں پر

سجائے ہیں در و دیوار، وہ خدائے جمال
جو آ گیا مرے ظلمت کدے میں کیا ہوگا
سیاہ خانے کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا
سجائے ہیں در و دیوار بہر استقبال!

یوں نہ کہو

کبھی نہ اس کے بھاگ کھلیں گے پیاسی مٹی رہے گی پیاسی
یوں نہ کہو مرجھائے پودے یونہی سدا مرجھائے رہیں گے
چلتے چلتے اس منزل میں آکر دھرتی رُک جائے گی
یو نہ کہو گہنائے سورج یونہی سدا گہنائے رہیں گے
تم تو شفق کے گُھلتے ملتے رنگوں کی اک گلکاری ہو
تم تو سحر کا ہلکا ہلکا نُور ہو جس سے دنیا جاگے
تم تو مہک ہو کھلتے پھول کی، چڑھتے دن کا اجلا پن ہو
تم نے تو سلجھائے ہیں آکر ذہن کے کتنے الجھے دھاگے
تم کو ہم نے اپنا کہا ہے، تم تو یوں نہ کہو، زنداں کے
کبھی نہ بھاری قفل کُھلیں گے، کبھی نہ زنجیریں ٹوٹیں گی!

جنگ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے، زمین پر فساد نہ
پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں
(قرآن)

(۱)

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگِ آہن سے لہو
سنگ پاروں سے ابلتی ہوئی دیکھی ہے شراب
میں نے دیکھا ہے سر شاخ پہ ہنگامِ بہار
آتشِ گُل سے جھلستے ہوئے خود برگِ گلاب
میں بھی اس بھیڑ میں تھا جو سر مقتل آئی
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے
مرگ انبوہ میں بھی جشن کا سامان نہ تھا
کوئی ایسا نہ تھا جو جامِ مئے تند بھرے
سر بہ زانو تھا کوئی، خاک بسر تھا کوئی
محفلِ زیست میں بجھتا سا شرر تھا کوئی

وسطِ مشرق کی یہ خندق تھا مقدر جن کا
اُن میں سے ایک نے اک روز کہا تھا مجھ سے
میں نے باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ وفا
اُن گھنی پلکوں میں وہ پیار سے بھرپور آنکھیں

ڈُبڈُبا آئیں، چھلک اٹھیں، ستارے ٹوٹے،
میں جو رخصت ہوا، جلتے ہوئے رخساروں پر
چھا گیا شام کا رنگ اور سہارے ٹوٹے
اُس کے ہونٹوں پہ کوئی بات تھی، میں سُن نہ سکا
میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں روک نہ لے
کیا خبر کہتی ہو، اک موت کا جھونکا آیا
ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سنے
کون اس سوختہ جاں، سوختہ تن کا، چھوڑو
بھاگ کر چھُپ گئے ہم اپنی کمیں گاہوں میں
کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں
دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے، جانے کب سے

میں نے سوچا کبھی مِل جائے، کہوں گا اُس سے
حاکمِ وقت کا منشا تھا، محبّت کی جگہ
اس کو نفرت ملے، نفرت ہے ابھی لطفِ خرام
جس جگہ جاؤ وہاں، شرق میں بھی غرب میں بھی
وسطِ مشرق کی زمیں نے تجھے بھیجا ہے سلام!

(۲)

دہقان سنوارتا ہے مٹی
چُن چُن کے بکھیرتا ہے دانے

اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے؟
اور دِل کو ٹٹولتا ہے رُک کر
پھر دُور اُفق کو دیکھتا ہے
کچھ رنگ سے تیرگی میں ڈوبے
مجبور، اُفق کو دیکھتا ہے

آنکھوں میں لہو کی بوند کانپی
گرتے ہی زمیں پہ کھو گئی پھر
پروان چڑھائے تھے جو پودے
وہ جل گئے، رات ہو گئی پھر
خالی کئی گوشے ہو گئے ہیں
تنہا تو نہ تھا، پہ رہ گیا ہے
کرنا پڑا نیشِ غم گوارا
کِس کِس کا نہ خون بہہ گیا ہے
پھر دُور اُفق کو دیکھتا ہے
یہ کھیت، یہ وسعتِ بیاباں
سر سبز زمین کے یہ پھل پھول
یہ سبزۂ تازہ، یہ خیاباں
سب آگ میں جل رہے ہیں گویا
تھم تھم کے پگھل رہے ہیں گویا
دہقان سنوارتا ہے مٹی

رُک رُک کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر جنگ آئے گی آزمانے؟

(۳)

ہم نے اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ دیا
ارضِ مغرب تہی آغوش تھی شاید اس کو
بھینچ لے پیار سے اور لوریاں دے دے کے کہے
"میں زمیں ہوں، مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!
میں یہ تفریق نہ کر پاؤں گی کس مٹی نے
تم کو پالا، تمھیں پروان چڑھایا تھا کبھی
یہ خد و خال ہیں کس گود کے پروردہ، تمھیں
کس نگہ سوز نے محبوب بنایا تھا کبھی
میری اولاد ہو تم، شرق میں بھی غرب میں بھی
میں زمیں ہوں، مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!"

"میرے دریا، مرے پھل پھول، مرا سبزۂ شوخ
سب تمھارے لیے ہیں، چھین جھپٹ ہے پھر کیوں
تم مرے لطف و محبّت کے نگہبان ہو سب
آپ ہی آپ مگر لاگ لپٹ ہے پھر کیوں
اتنی دوُر آئے تھے کیوں موت اگر پیاری تھی؟
تم نہ کچھ اپنے ہی کام آئے، نہ غیروں ہی کے کام

جن پہ تم چھپٹے تھے وہ بھی تو کوئی غیر نہیں
رشتہ خوں ہے وہی، صرف ہیں بدلے ہوئے نام
تم تھکے ہارے ہو، گم کردہَ رہ ہو، سو جاؤ
صبح ہو جائے گی، تاریکیِ شب میں کھو جاؤ!"

مجھ سے یوں چھوٹ گیا میرا وہ برسوں کا رفیق
گویا مٹّی کا کھلونا تھا کہ توڑا پھینکا
ہم بھی اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ گئے
مَوت نے زیست کو چپکے سے جھنجھوڑا، پھینکا!

اک گھنے پیڑ کی پھیلی ہوئی بوجھل شاخیں
ٹوٹ کر گرنے لگیں، شعلہ جوالہ اٹھا
پتّیاں، پھول، ہری ڈالیاں پھولوں سے لدی
سب ہی کچھ جلنے لگا، جل کے یونہی خاک ہوا

اندوختہ

گہرا نیلا بسیط و بلند آسماں
اتنا خاموش، ٹھہرا ہوا، پُرسکوں
اس طرح دیکھتا ہے مجھے جیسے میں
اپنے گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ ہوں
تم کہاں ہو میری روح کی روشنی
تم تو کہتی تھیں یہ درد پائندہ ہے
تم کہاں ہو بہشتِ نگہ، مہرِ من؟
تم سے اب تک مری داستاں زندہ ہے
تم کہاں ہو، مرے راستوں کے دیے
بُجھ گئے، پھر بھی ہر چیز تابندہ ہے
میں ملوں کارخانوں کے بوجھل دھوئیں
قحبہ خانوں کی مغموم تابندگی
کاہنوں کی محبّت کا فضلہ جسے
ربِّ موجود و معدوم نے بخش دی
دائمی زندگی، میں تمھارے لیے
عہدِ قارون کی گیر اور دار سے
اپنی زخمی محبت بچا لایا ہوں!

سلسلے

شہر در شہر، قریہ در قریہ
سالہا سال سے بھٹکتا ہوں
بارہا یوں ہوا کہ یہ دنیا
مجھ کو ایسی دکھائی دی جیسے
صبح کی ضَو سے پھول کھلتا ہو
بارہا یوں ہوا کہ روشن چاند
یوں لگا جیسے ایک اندھا کنواں
یا کوئی گہرا زخم رِستا ہوا
میں بہر کیف پھر بھی زندہ ہوں
اور کل سوچتا رہا پہروں
مجھ کو ایسی کبھی لگن تو نہ تھی
ہر جگہ تیری یاد کیوں آئی؟

محبّت

رات میں دیر تک اُڑتے بادل کھلے چاند کی کشمکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھا کیا جیسے یہ ماجرا
میری ہی داستاں کا کوئی پارہ ہے، کون آوارہ ہے
تو کہ میں؟ ایک چھوٹا سا طائر فضا میں تھا نغمہ سرا
دُور نزدیک، پھر دُور ہر سمت اک تان کی گونج تھی
رات آہستہ آہستہ رُک رُک کے ایسے گزرتی رہی
جیسے میں اور تُو وقت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے
شہر کی سونی، سنسان، خاموش گلیوں میں گُم ہو گئے!
رات کی کالی دھاری سے دن کی سفیدی الگ ہوگئی
دونوں اک دوسرے سے الگ ہوگئے، ہاں وہ طائر مگر
یونہی گاتا رہا، اُڑتے بادل، کھلی چاندنی کا سماں
وقت کے ساتھ ساتھ آپ تبدیل تحلیل ہوتا رہا
میں تجھے، تو مجھے ڈھونڈتی رہ گئی، وقت اُڑتا گیا
ان خنک سانولی بھیگی راتوں کی پُرشوق تنہائیاں
صرف اک داغِ غم تاب کی شکل میں منجمد ہوگئیں،
پر وہ نغمہ، وہ حُسنِ زمین و زماں، روشنی،
اس پرندے کی وہ دھیمی آواز، وہ میٹھی کلکاریاں
بنتِ آغاز و انجام کے باکرہ بطن میں رہ گئیں!
اور اک نسل سے دوسری نسل تک عکسِ روحِ ازل

عکسِ روحِ ابد ایسے نشو و نما پائے گا خون میں
جیسے بنجر زمیں قطرۂ ابر سے سبز و شاداب ہو!
اُڑتے بادل کھلی چاندنی کا سماں، میٹھی تنہائیاں
سب کی سب بَن کے مٹتی ہوئی پیاری تصویریں ہیں
صرف تبدیل ہوتی ہوئی روشنی کی جھلک زندہ ہے
صرف حُسنِ ازل اور حُسنِ ابد کی مہک زندہ ہے
صرف اس طائرِ خوش ادا خوش نوا کی لہک زندہ ہے
ایک دن آئے گا تُو بھی مر جائے گی، میں بھی مر جاؤں گا!

فصل ۵

آب جو، اشاعت، ۱۹۵۹

پیش لفظ: اخترالایمان

مطبوعہ: نیا ادارہ، لاہور

(اس مجموعے میں گرداب کی نظمیں اور تاریک سیارہ کے بعد کی ۲۶ نظمیں شامل ہیں)

اور

یادیں، اشاعت ۱۹۶۱

پیش لفظ: اخترالایمان

مطبوعہ: رخشندہ کتاب گھر، بمبئی

(اس مجموعے میں آب جو کی نظمیں اور اُس کے بعد کی ۵ نظمیں شامل ہیں۔ 'یادیں' کا ایک انتخاب اسی نام سے ستار پبلیکیشنز، دہلی نے ۱۹۶۴ میں چھاپا)

وہ مکان

سنگ و خشت و آہن سے
میں نے اپنی اُمیدیں
ایسے باندھ لیں جیسے
سنگ و خشت و آہن میں
رابطہ ہوں میں کوئی
ایستادہ رہتا ہوں
اس مکان کے نیچے
تاکہ وہ پری پیکر
رات کے کسی لمحے
خواب سے اگر چونکے
دیکھ لے مجھے اک بار
یہ وفائے مرگ آثار
میرے دَم سے زندہ ہے
ایسی مُردہ ساعت میں
جاگتے ہیں ہم دو ہی
ایک میں ہوں اور اک وہ
کارخانے کی چمنی
جو ہے ایک منعم کی
ذاتی ملکیت اب بھی!

لمحہ لمحہ کم ہو کر
رات کٹتی جاتی ہے
جو نفس گزرتا ہے
عمر گھٹتی جاتی ہے
اور اپنے امکاں میں
اس قدر نہیں منہ کو
زخم کی طرح سی لیں
اس قدر نہیں غم کو
زہر کی طرح پی لیں
اس قدر نہیں ان سے
دوُر رہ کے بھی جی لیں!

نومبر 1951

انتظار

زندگی اک طویل بَل کھاتی
شاہراہِ عظیم ہے جس پر
نرم مٹّی کی گود کے پالے
کتنے بھرپور سایہ دار شجر
کتنی سرشور ندیاں، چشمے
کتنے ماہ و نجوم، آوارہ
مشعلیں اپنی تیرگی میں لیے
کتنی خوشبوئیں رنگ رنگ کے پھول
منتظر راہ رو کی آمد کے
صبح سے شام تک سنورتے ہیں
روز و شب انتظار کرتے ہیں!

ترکِ وفا

سرما کی اداس چاندنی کا
شاید تمہیں یاد ہو وہ ہنگام
جب عہد کیا تھا میں نے تم سے
چاہے مری زندگی کے ایام
یا اہلِ ہوس کی بندگی میں
عسرت میں کٹیں کہ زر گری میں
لیکن میں بگولہ یا کسی دن
آؤں گا تمہاری آرزو میں
یا شکوۂ جورِ دہر کرنے
اشکوں کا خلوص آزمانے
یا دینے مسرّتوں کا پیغام
اور اپنی وفا کی داد پانے
گر اور کسی کی ہوگئیں تم
جینے دوں گا نہ میں جیوں گا
تم کو بھی پلاؤں گا وہی میں
جو زہر حیات خود پیوں گا
میں آج وہ عہد توڑتا ہوں
یہ رسمِ وفا ہی چھوڑتا ہوں!

مئی ۱۹۵۳

بُلاوا

نگر نگر کے، دیس دیس کے، پربت، ٹیلے اور بیاباں
ڈھونڈ رہے ہیں اب تک مجھ کو، کھیل رہے ہیں میرے ارماں
میرے سپنے، میرے آنسو، ان کی چھلنی چھاؤں میں جیسے
دھول میں بیٹھے کھیل رہے ہوں بالک باپ سے روٹھے روٹھے!

دن کے اجالے، سانجھ کی لالی، رات کے اندھیارے سے کوئی
مجھ کو آوازیں دیتا ہے، آؤ آؤ، آؤ آؤ
میری روح کی جوالا مجھ کو پھونک رہی ہے دھیرے دھیرے
میری آگ بھڑک اٹھی ہے، کوئی بجھاؤ، کوئی بجھاؤ!

میں بھٹکا بھٹکا پھرتا ہوں کھوج میں تیری جس نے مجھ کو
کتنی بار پکارا لیکن ڈھونڈ نہ پایا اب تک تجھ کو
میرے سنگی میرے ساتھی تیرے کارن چھوٹ گئے ہیں
تیرے کارن جگ سے میرے کتنے ناتے ٹوٹ گئے ہیں

میں ہوں ایسا پات ہوا میں پیڑ سے جو ٹوٹے اور سوچے
دھرتی میری گور ہے یا گھر، یہ نیلا آکاش جو سر پر
پھیلا پھیلا ہے، اور اس کے سورج چاند ستارے مل کر
میرا دیپ جلا بھی دیں گے، یا سب کے سب روپ دکھا کر

ایک اک کر کے کھو جائیں گے، جیسے میرے آنسو اکثر
پلکوں پر تھرا تھرا کر تاریکی میں کھو جاتے ہیں
جیسے بالک مانگ مانگ کر نئے کھلونے سو جاتے ہیں!

اکتوبر ۱۹۴۸

چلو کہ آج . . .

کوئی جو رہتا ہے رہنے دو مصلحت کا شکار
چلو کہ جشنِ بہاراں منائیں گے سب یار
چلو نکھاریں گے اپنے لہو سے عارضِ گل
یہی ہے رسمِ وفا اور من چلوں کا شعار
جو زندگی میں ہے وہ زہر ہم ہی پی ڈالیں
چلو ہٹائیں گے پلکوں سے راستوں کے خار
یہاں تو سب ہی ستم دیدہ، غم گزیدہ ہیں
کرے گا کون بھلا زخمہائے دِل کا شمار
چلو کہ آج رکھی جائے گی نہادِ چمن
چلو کہ آج بہت دوست آئیں گے سرِ دار!

دسمبر ۱۹۵۲

شفقی

رنگوں کا چشمہ سا چھوٹا ماضی کے اندھے غاروں سے
سرگوشی کے گھنگرو کھنکے گرد و پیش کی دیواروں سے
یاد کے بوجھل پردے اٹھے، کانوں میں جانی انجانی
لوچ بھری آوازیں آئیں جیسے کوئی ایک کہانی
دوٗر پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا پھولوں سے کہتا ہو
جیسے جھرنا قطرہ قطرہ رِس رِس کر بہتا رہتا ہو
مدّت بیتی ان باتوں کو مضطر آج تلک رہتا ہے
دشتِ ہویدا کا دیوانہ تند بگولوں سے کہتا ہے
آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے دکھ سے چوٗر مری نس نس ہے
ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو ایک دفعہ کی اور ہوس ہے!

مئی ۱۹۴۸

شکستِ خواب

کون ہو بنتِ مہ و مہر درخشان و نجوم
کس لیے آئی ہو، غم خانہ منوّر کرنے؟

منتظر میں بھی تھا برسوں سے کوئی سیم بدن
نرم مخمل کی طرح پھول سی ہلکی ہمہ نُور
یوں بڑھے میری طرف جیسے ندی کی لہریں
رات بھر ناچنے والی کی طرح نیند سے چُور
ہاتھ پھیلائے کنارے کی طرف بڑھتی ہیں
یوں بڑھے میری طرف جیسے کہیں شہر سے دوٗر
رات کے بطن میں سوئی ہوئی آسودہ کرن
سبزۂ خاک بداماں کی طرف بڑھتی ہے
اور اک آن میں ڈھل جاتے ہیں سب رنج و محن

کون ہو بنتِ مہ و مہر درخشان و نجوم
کس لیے آئی ہو، غم خانہ منوّر کرنے؟

اس کے ہر گوشے کو مہکا دو بنا دو فردوس
تم اسے اپنی محبّت سے فروزاں کر دو
بیت کی کرسی، کتابیں، وہ پُرانے جوتے
جھاڑ کر ان کو ذرا گھر میں چراغاں کر دو!

جنوری ۱۹۴۹

آخر شب

ڈھلی رات تارے جھپکنے لگے آنکھ، شبنم کے ناسُفتہ موتی
سر شاخِ گل اپنے انجام سے کانپ اٹھے، خواب پورے ادھورے
اڑے جیسے اُودے، رُوپہلی، سنہرے، سیہ، ملگجے، بھورے بادل
تہہِ آسماں روئی کے نرم گالوں کی مانند ہر سمت اُڑتے
پھریں، اور ندّاف کی ضرب کو بھول کر پَل گزرتے گزرتے
سر بالشِ خاک سب ضدّی بچّوں کی مانند روتے مچلتے
چڑھی نیند سے چُور ہو کر وہیں سو رہیں، یاد کی سبز پریاں
گھنے جنگلوں، لالہ زاروں، پہاڑوں، بھری وادیوں سے گزرتیں
کہیں قافِ ماضی کے نمناک غاروں میں روپوش ہونے لگی ہیں

مبارک ہو میں نے سنا ہے کہ تم پھول سی جان کی ماں بنی ہو
مبارک سنا ہے تمہارا ہر اک زخم اب مندمل ہوگیا ہے!

مارچ ۱۹۴۹

اشعار

ابھی گلال ہوں عارض، عرق عرق ہو جبیں
ذرا جو کہہ دوں، نہیں تم سے بڑھ کے کوئی حسیں

بتانِ خلدِ تصوّر کا ذکر کرتا ہوں
تمھارے قامت و رخسار و لب کی بات نہیں

تمھارے نام سے باغ و بہار ہے دنیا
تمھاری چاہ سے لگتا ہے جی کو روگ کہیں

اب آگے دیکھیے کیا ہو مآلِ الفت کا
قبائے گُل تو بنا دی ہے عاشقوں نے زمیں

آخری ملاقات

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

آتی نہیں کہیں سے دِلِ زندہ کی صدا
سُونے پڑے ہیں کوچہ و بازار عشق کے
ہے شمعِ انجمن کا نیا حُسن جاں گداز
شاید نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے
تازہ نہ رہ سکیں گی روایاتِ دشت و دَر
وہ فتنہ سر گئے جنھیں کانٹے عزیز تھے

اب کچھ نہیں تو نیند سے آنکھیں جلائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی پھر کبھی
اک بار پھر ملے ہیں، ذرا مسکرا تو لیں!
کیا جانے اب نہ الفتِ دیرینہ یاد آئے
اِس حُسنِ اختیار پہ آنکھیں جھکا تو لیں
برسا لبوں سے پھول، تری عمر ہو دراز
سنبھلے ہوئے تو ہیں پہ ذرا ڈگمگا تو لیں

اور اپنا اپنا عہدِ وفا بھول جائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

برسوں کی بات ہے کہ مرے جی میں آئی تھی
میں سوچتا تھا تجھ سے کہوں، چھوڑ کیا کہوں
اب کون اُن شکستہ مزاروں کی بات لائے
ماضی پہ اپنے حال کو ترجیح کیوں نہ دوں
ماتم خزاں کا ہو کہ بہاروں کا، ایک ہے
شاید نہ پھر ملے تری آنکھوں کا یہ فسوں

جو شمعِ انتظار جلی تھی بجھائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

رخصت

فضائیں نم، گرد و پیش بوجھل، زمین پاؤں تلے ہے دلدل
نہ جاؤ ہر اشک کہہ رہا ہے، لبوں پہ وعدے مچل رہے ہیں
ہر ایک شاخِ نہالِ امید کا ہے نغمہ گلو گرفتہ
خوشی کی شاداب و سبز وادی سے شور چشمے اُبل رہے ہیں
مرے لیے تند ہے یہ صہبا، یہ مے ترے گرم آنسوؤں کی
پگھلنے والا ہے ظرف میرا، مگر ترے جام ڈھل رہے ہیں
ابھی سے یوں مضمحل نہ ہو تو، بگولہ خُو ہوں ابھی تو میں بھی
ابھی تو گردش میں ہے زمانہ، ابھی تو سیارے چل رہے ہیں
ترے لیے سنگ ہی سہی میں، بجھے نہیں ہیں مرے شرارے
ترے لیے برف ہی سہی میں، مگر مرے داغ جل رہے ہیں

اگست ۱۹۴۸

ترغیب اور اس کے بعد

ترغیب:

پھر میں کام میں لگ جاؤں گا، آ فرصت ہے پیار کریں
ناگن سی بل کھاتی اُٹھ، اور میری گود میں آن مچل
بھید بھاؤ کی بستی میں کوئی بھید بھاؤ کا نام نہ لے
ہستی پر یوں چھا جا بڑھ کر، شرمندہ ہو جائے اجل
چھوڑ یہ لاج کا گھونگھٹ، کب تک رہے گا ان آنکھوں کے ساتھ
چڑھتی رات ہے ڈھلتا سورج کھڑی کھڑی مت پاؤں مَل
پھر یہ جادو سو جائے گا، سے جو بیتا، گہری نیند
جو کچھ ہے انمول ہے اب تک ایک اک لمحہ، ایک اک پل
بن چھوئی مٹی کی خوشبو، اس کا سوندھا سوندھا پن
سب کچھ چھن جائے گا اک دن، اب بھی وقت ہے دیکھ سنبھل
نرم رگوں میں میٹھی ٹیس جو یہ اٹھتی ہے آج
بڑھتی موج کا ریلا ہے اک ٹیس نہ یہ اٹھے گی کل
مست رسیلی آنکھوں سے یہ چھلکی چھلکی سی اک شئے
جس نے آج اپنایا اس کو سمجھو اس کے کام سپھل
میں تیرے شعلوں سے کھیلوں، تو بھی میری آگ سے کھیل
میں بھی تیری نیند چُراؤں، تُو بھی میری نیندیں چھل
نرم ہوا کے جھونکوں سے ہی کھلتی ہے پھولوں کی آنکھ
ورنہ برسوں ساتھ رہے ہیں ٹھہرا پانی بند کنول!

اس کے بعد:

بھیگی رات کا نشہ ٹوٹا، ڈوب گیا ہے چڑھتا چاند
تھکے تھکے ہیں اعضا سارے اور ہوئیں پلکیں بوجھل
شبنم کا رس پی گئیں کرنیں، دن کا رنگ چمک اٹھا
گونج ہے بھونروں کی کانوں میں، پر ہیں آنکھوں سے اوجھل
حُسن اور عشق کی اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ دیا
میں اپنے رستے جاتا ہوں اور تو اپنی ڈگر پہ چل!

مَیں اور تُو

نالہ نیم شب کی طرح میں اگر یوں نہ بے چین، برباد رہتا
باد پا بادلوں کی طرح میں اگر یوں نہ آوارہ آوارہ پھرتا
آندھیوں اور بگولوں کی مانند میں گر نہ در در کی یوں خاک اڑاتا
اور سر شور چشموں کے مانند یوں جا چٹانوں سے ٹکراتا، گرتا
مجھ میں یہ زندگی کی لگن، یہ حرارت، تڑپ، جو بھی تُم دیکھتی ہو
اس وجود و عدم کے خلا میں کہیں برف کی طرح رہ جاتی گل کر
ان فضاؤں میں تحلیل ہو کر مجھے اور تجھے بُھول چکتی ستم گر!

دسمبر ۱۹۵۴

رزم

ایک آواز کے ساتھ اٹھیں نگاہیں سب کی
جھک گئیں، اٹھتے ہی، کچھ رنگ فضا میں ناچے
شور سا اٹھا، بہار آئی لہو سے کھیلو
خار و خس جامۂ گل رنگ پہن کر جاگے!

خون پروردہ بہار آئی شہیدوں کے لیے
سبزہ و گل کا کفن پہنے مگر پا نہ سکی
استخواں ہائے شکستہ بھی شہیدوں کے کہیں
ایک نغمہ بھی سرِ محفلِ نو گا نہ سکی!

ایک آواز کے ساتھ اٹھیں نگاہیں سب کی
جھک گئیں اٹھتے ہی، آباد تھا اک ہو کا دیار
گرم رفتار تھے ہر سمت بگولے جس میں
رقص کرتی ہوئی پھرتی تھی خزاں غم بکنار!

اگست ۱۹۴۶

قافلہ

یہاں سے دور نہیں خیمۂ نگارِ سحر
قدم بڑھاؤ چپ و راست ہے گراں خوابی!

وہ مَن چلے، یہ زمین جن کے دَم سے زندہ ہے
وہ جن کا خون شفق، سرخیِ گُلِ تازہ
سمن بروں کی حنا، غازۂ لب و عارض
بگولہ پا، شرر آسا، سپہر اندازہ
کمند ڈالنے والے مہِ درخشاں پر
تم ان کے قصّوں کی چھاؤں میں پرورش پا کر
جواں ہوئے ہو، خراماں سہی بڑھے جاؤ
یہاں سے دور نہیں خیمۂ نگارِ سحر!

طویل راہ کٹے اور سفر نہ ہو معلوم
کچھ اُن کے جور و تغافل کا ذکر کرتے چلو
زبان و دِل پہ ہیں پہرے بھی، بھول جاؤ یہ بات
بلا کشو خمِ کاکل کا ذکر کرتے چلو
مہک رہی ہے شبِ نیم جاں تصوّر سے
اُسی گلاب دہن سادہ لوح ساحر کے
وہی ہے قامتِ موزوں، وہی ہے سادہ لباس
وہی بھلا سا تبسّم جو زندگی کی اساس

وہی حلاوتِ گفتار، بات میں ٹھہراؤ
وہی نظر کا چرانا، وہی ہے نرم سبھاؤ
وہی ہے زخموں پہ مرہم لگانے کا انداز
وہی کھنکتی ہوئی کچھ دبی دبی آواز
وہی نگاہ میں اک شستگی پہ جب دیکھا
ہمیشہ میں یہی سمجھا کہ دے رہے ہیں شراب
اس احتیاط نے رُسوا کیا اُنھیں بھی بہت
اس التزام نے مجھ کو بھی کردیا تھا خراب

دہن دریدہ سگ و دشمنِ سحر خُفاش
شغال و گرگ، نہنگ و پلنگ، اژدر و مار
کمین گاہوں میں بیٹھے ہیں منہ چھپائے ہوئے
یہ دیکھنا ہے کہ کرتا ہے کون کس کا شکار؟
قدم بڑھاؤ چپ و راست ہے گراں خوابی
دبے دبے چلیں، کچھ تھوڑی احتیاط کریں
یہاں سے دور نہیں خیمۂ نگارِ سحر
مگر یہ خامشی کیوں، اور کوئی بات کریں
تلاشِ زیست میں نکلے ہیں مرگ میں تو نہیں
گراں ہے ظلمتِ شب اپنی اپنی باری بھریں
سناؤ کوئی کسی رشکِ لالہ کی روداد
خموشی جس کی شکر، گفتگو ہو قند و نبات
کسی شرارہ صفت خوب رُو کی چشمِ کرم
ہوئی تو کیسے، چلی کیسے ننگ و نام کی بات؟
لگی تو کیسے لگی ٹھیس آبگینوں کو
کھنک جو پیدا ہوئی کیا ہوا مآلِ حیات
خرامِ بادِ بہاری کا ذکر چھیڑیں کچھ

کہ اس سے مِلتا ہو شاید کسی حسیں کا خرام
شمیم مشک فشاں ہو نہ گیسوؤں کی مہک
جو معجزہ ہے مسیحا کا ہو نہ اس کا کلام

سناؤ کوئی کسی شعلہ خُو کا افسانہ
متاعِ دِل کو سمجھتا رہا جو ہیزمِ دِل
وہ ایک زوُد پشیماں جو آتشِ گل سے
جلا کیا نہ ہوا مرگِ عاشقاں پہ خجل
وہ جس کی چینِ جبیں ہو نظر کا نذرانہ!

گراں ہے ظلمت شب وقت کاٹنے کے لیے
کبھی خوشی کبھی غم کی بھی کوئی بات سنائیں
برے بھلے یہی سب لوگ اپنی دنیا ہیں
نقیبِ صبحِ بہاراں انھیں کی خیر منائیں
انھیں کو ساتھ لیے ان کے ساتھ بڑھتے چلیں
انہیں سے رونقِ بزمِ جہاں کا امکاں ہے!

۱۹۵۳

جانِ شیریں

تم سے ہمیں اور کیا مِلے گا
بربادیِ دِل، خرابیٔ جاں
دیکھو تو ذرا تسلّیوں کا
تھوڑا سُا اگر ہے کوئی امکاں
یہ گردشِ روزگار و غم سے
لمحے جو بچے ہیں جانِ شیریں
ہم بھی انھیں پائدار کر لیں
آلام کو داغدار کر لیں

مارچ ۱۹۵۳

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی منڈیوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سِنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گُم، تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سِن حسینوں میں بہت خوش کام و دِل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مُڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تُند چشموں کا، رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہرگام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا

تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عزّوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا، اک حد فاصل مقرّر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کُن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے!
اسی نے خسروی دی ہے، لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی مگر مجھ کو

خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اُٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزیِ شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تُو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح، لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مرچکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

دسمبر ۱۹۵۴

اِن سے اندازۂ بہار نہ کر

اِن سے اندازۂ بہار نہ کر

یہ شگفتہ گلوں کی طرح حسیں
اُجلے اُجلے سفید پوش جواں
چشمِ غمّاز، رت جگے، چُہلیں
ابروؤں کی کھنچی ہوئی سی کماں
تتلیاں، پھول، بھونرے، راز و نیاز
اپنی دنیا میں ایسے کھیل کہاں؟

یہ ہیں افراد اس جماعت کے
جن کو زخموں سے چُور، سینہ فگار
آدمیت کا نالۂ دِل دوز
جن کو محبوس زندگی کی پکار
ایسا نغمہ سنائی دیتی ہے
جو ہو فردوسِ گوش و رُوحِ بہار!

خامہ سوزی ہے جیسا مرا شعار
ایسے ان کا ہے زر کا استحصال
جیسے میں جمع کرتا ہوں آنسو

ایسے یہ جمع کرتے ہیں زر و مال
قحط، ہنگامے، حادثات، وبائیں
ابتری، خانہ جنگیاں، فتنے
ان کو اس طرح راس آتے ہیں
جیسے کوّوں کو ڈھیر فُضلے کے

یہ شگفتہ گلوں کی طرح حسیں
اُجلے اُجلے سفید پوش جواں
چشمِ غمّاز، رت جگے، چُہلیں
ابروؤں کی کھنچی ہوئی سی کماں
تتلیاں، پھول، بھونرے، راز و نیاز
اپنی دنیا میں ایسے کھیل کہاں؟

اِن سے اندازۂ بہار نہ کر!
ستمبر ۱۹۵۶

تماشا

جشنِ نوروز ہے سجے کوچے
نُور سے شہر جگمگاتا ہے
اک سمندر کی موج ہے کہ ہجوم
یا بھرا کھیت لہلہاتا ہے
اک طرف خوش خرام یوں ہیں حسیں
تندیِ مے کا لطف آتا ہے
اک طرف لڑکھڑاتا نشے میں
مے گساروں کا خیل جاتا ہے
بادہ نوشی ہزار بند ہوئی
محتسب کیا کسی کا داتا ہے
اک صدا گونجتی ہے گلیوں میں
پینے والو خدا پلاتا ہے
ہر بدر رَو ذخیرہ گاہ بنی
ہر طرف ساقیوں کا تانتا ہے
اب مئے خانہ ساز کا ہے دَور
کون باہر کی منہ لگاتا ہے
رسمِ جامِ سفال عام ہوئی
خوں شہیدوں کا رنگ لاتا ہے
شورہ پشتوں کی آج بن آئی

ہر نجیب اُن کے ناز اٹھاتا ہے
مصلحِ وقت کی سیاست کے
ہر کفن چور گیت گاتا ہے
کوچہ گردوں نے راہ روکی ہے
کوتوال اِن سے منہ چُراتا ہے
لوگ کہتے ہیں ساز باز ہے کچھ
غیب کا علم کس کو آتا ہے
س تماشے کے پیچھے بیٹھا کون
دِل رُبائی سے مسکراتا ہے؟

اکتوبر ۱۹۵۶

آگہی

میں جب طفلِ مکتب تھا، ہر بات، ہر فلسفہ جانتا تھا
کھڑے ہو کے منبر پہ پہروں سلاطینِ پارین و حاضر
حکایاتِ شیرین و تلخ ان کی، ان کے درخشاں جرائم
جو صفحاتِ تاریخ پر کارنامے ہیں، ان کے اوامر
نواہی، حکیموں کے اقوال، دانا خطیبوں کے خطبے
جنھیں مستمندوں نے باقی رکھا، اس کا مخفی و ظاہر
فنونِ لطیفہ، خداوند کے حکم نامے، فرامین
جنہیں مسخ کرتے رہے پیرزادے، جہاں کے عناصر
ہر اک سخت موضوع پر اس طرح بولتا تھا کہ مجھ کو
سمندر سمجھتے تھے سب علم و فن کا، ہر اک میری خاطر
تگ و دَو میں رہتا تھا، لیکن یکایک ہوا کیا یہ مجھ کو
یہ محسوس ہوتا ہے سوتے سے اٹھا ہوں، ہلنے سے قاصر
کسی بحر کے سُونے ساحل پہ بیٹھا ہوں گردن جھکائے
سرِ شام آئی ہے دیکھو تو ہے آگہی کتنی شاطر!

فروری ۱۹۵۸

یادیں

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رُکتے رُکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو، گزری بات ہے نقش بر آب
یہ روداد ہے اپنے سفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شہر تمنا کے مرکز میں، لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سُو ہے اک رنگیں گلزار کھلا
وہ اک بالک جس کو گھر سے ایک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی انگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا
بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرا بے
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازا میں چُپ چُپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرا بے میں

ہونٹ تبسّم کے عادی ہیں، ورنہ روح میں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں. اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا، جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا، کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی آباد خرابے میں

کالے کوس غمِ الفت کے اور میں نانِ شبینہ جُو
کبھی چمن زاروں میں اُلجھا اور کبھی گندم کی بُو
نافۂ مشک تتاری بن کر لیے پھری مجھ کو ہر سُو
یہی حیاتِ صاعقہ فطرت بنی تعطّل کبھی نمو
کبھی کیا رم عشق سے ایسے جیسے کوئی وحشی آہو

اور کبھی مر مر کے سحر کی آباد خرابے میں
دیکھو ہم کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

کبھی غنیمِ جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارضِ الم میں خوار ہوئے ہم، بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جگ ہوئی نہ رات
ہر سُو مہوش سادہ قاتل لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں پھولوں کی مہکار سی بات
جوں توں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

راہِ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار مِلے
ابرِ بہاراں، عکسِ نگاراں، خالِ رُخِ دلدار مِلے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو، کچھ خنجر کی دھار مِلے
کچھ منجدھار میں، کچھ ساحل پر، کچھ دریا کے پار مِلے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یونہی ہاتھ پسار مِلے
صرف ان کی خوبی پہ نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے جب تھی پل بھر کی دوری بھی شاق

کہیں کوئی ناسور نہیں، گو حائل ہے برسوں کا فراق
کرمِ فراموشی نے دیکھو چاٹ لیے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں، چلو ہوا قرضہ بے باق
کھلی تو آخر بات اثر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

خواب تھے اک دن اوجِ زمیں سے کاہکشاں کو چھولیں گے
کھیلیں گے گل رنگ شفق سے، قوسِ قزح میں جھولیں گے
بادِ بہاری بن کے چلیں گے، سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگیں جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغِ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوشبو لیں گے
ملی خلش پر زخمِ جگر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

خوار ہوئے دمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اٹھے جیسے چھوا تو کردے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی، ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر، کبھی قلندر، کبھی بگولہ، کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گزر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

زیست خدا جانے ہے کیا شئے، بھوک، تجسّس، اشک، فرار
پھول سے بچے زہرہ جبینیں، مرد مجسم باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں، کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روحِ ارض کو آخر اور یہ زہریلے افکار
کس مٹّی سے اُگتے ہیں سب، جینا کیوں ہے اک بیگار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی آباد خرابے میں

دوُر کہیں وہ کوئل کوکی، رات کے سناٹے میں دوُر
کچی زمیں پر بکھرا ہوگا، مہکا مہکا آم کا بُور
بارِ مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چوُر
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے، لو دیکھو وہ صبح کا نُور
چاہِ شب سے پھوٹ نکلا، میں مغموم کبھی مسرور
سوچ رہا ہوں اِدھر اُدھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

نیند سے اب بھی دور ہیں آنکھیں گو کہ رہیں شب بھر بے خواب
یادوں کے بے معنی دفتر، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پَل ہو گزری بات ہے نقش بر آب
مستقبل کی سوچ، اٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

جون ۱۹۵۷

پسِ دیوارِ چمن

نکہتِ گُل نے سحر دم اُسے بیدار کیا
اور چپکے سے کہا، جا پسِ دیوارِ چمن
عشق پیچاں کی گھنی بیل کے پیچھے تنہا
چاہنے والا ترا دِل میں لیے تیری لگن
منتظر کب سے ہے، وہ چونک کے اُٹھّی جیسے
اپنی آہٹ سے کوئی آہوئے وحشی چونکے
پھر چلی سوئے چمن زلفوں کو شانہ کرتی
اس تغافل سے کہ جیسے پئے گُلگشت کوئی
یونہی جاتا ہو، کوئی ملنے کا ارمان نہ ہو
اپنے سائے کے سوا اور سے پہچان نہ ہو
بدرقہ بوئے گُلِ تر تھی کہیں بادِ نسیم
وہ ہی وہ فرش پہ تھی، عرش پہ تھا ربِّ کریم
لہلہاتا ہوا سبزہ تھا، ندی سہج خرام
چال ایسی کہ نہیں جس کا کہیں کوئی بھی نام
عنبر و مُشک کا اک قافلہ تھا زلف کا بار
یا کوئی ابرِ رواں دوشِ ہوا پر تھا سوار
پھول بوٹے ہمہ تن گوش تھے کچھ منہ سے کہے
خاک لپٹی چلی جاتی تھی قدم تھامے ہوئے
راہ میں کتنی جگہ شاخوں نے دامن پکڑا

بارہا شانہ سے بے دھیانی میں آنچل ڈھلکا
شاخ سی لچکی، تخیّل سی رُکی، اٹھلائی
ہر قدم پر نئے انداز سے ٹھوکر کھائی

میں وہاں گوش بر آواز جو بیٹھا تھا، اُٹھا
اور اُسے لینے کو آغوش میں جیسے ہی بڑھا
پاؤں الجھا، گرا، یوں آنکھ کھلی پچھلے پہر
اور دیکھا کہ ابھی باقی ہے کچھ شب کا سفر
یونہی بیٹھا رہا، دیکھا کیا ہوتے تحلیل
پل کو گھڑیوں میں، دنوں سالوں میں، لحاتِ جمیل
زخم بنتے گئے، ناسور بنے، اشک بنے
ہم جو اک گردشِ پرکار تھے، ویسے ہی رہے!
ناچتا رہتا ہے آگے سحر و شام یونہیں
لوحِ تدبیر پہ لکھا ہوا اک حرف 'نہیں'

جون ۱۹۵۷

یہ دَور

میں اسی طور سے گرداں ہوں، زمانے میں، وہی
صبح ہے، شام ہے، گہنائی ہوئی راتیں ہیں
کوئی آغاز، نہ انجام، نہ منزل، نہ سفر
سب وہی دوست ہیں، دہرائی ہوئی باتیں ہیں
چہرے اُترے ہوئے دن رات کی محنت کے سبب
سب وہی قضیے، شکایات، مداراتیں ہیں
سب وہی بغض و حسد، رشک و رقابت، شکوے
دامِ تزویر ہے، الجھاؤ کی سو گھاتیں ہیں
سب گلی کوچے وہی، لوگ وہی، موڑ وہی
یہ وہی سردی ہے، یہ گرمی، یہ برساتیں ہیں
زلف کی بات ہے یا زہر کہ سب ڈرتے ہیں
کوئی دِل دار، نہ دِلبر، نہ ملاقاتیں ہیں
کوئی بشاش ہنسی، جینے کی نو خیز اُمنگ
کچھ نہیں، بس غم و اندوہ کی باراتیں ہیں
تنگ دامانی کا شکوہ ہے خدا سے ہر وقت
ہر مرض کے لیے نسخے میں مناجاتیں ہیں
جی الٹ جاتا ہے اس حبسِ مسلسل سے مرا
ذہن جاتا کسی نازشِ خوبی کی طرف
یعنی وہ پرتوِ گل خانہ بر اندازِ چمن

ایک پُروائی کا جھونکا سا، گھنی بدلی سی
شاہدِ نکہت و انوارِ سحر، راحتِ من
رسمِ دِل داری ہے اس سیم بدن کے دم سے
اور مرے دم سے ہے عشاق کا بے داغ چلن!

کس کے قدموں کی ہے یہ چاپ، یقیناً ہے وہی
یہ یقیناً ہے وہی سروِ چمن، بنتِ بہار
کوئی رُت آئے، زمانہ نہیں بدلے گا اسے
جانِ من تم ہو؟ نہیں! وہ لب و عارض، وہ نکھار؟
نغمگی جسم کی، وہ لوچ سا، نشہ سا مدام
ایک چلتا ہوا جادُو سا نگاہوں کا قرار؟
سچ کہو تُم ہی ہو؟ آتا نہیں آنکھوں کو یقیں؟

جون ۱۹۵۷

سحر

کون سی راحتِ دَوراں جو میسّر آئی
داغ دے کر نہ گئی، کون سے لمحاتِ نشاط
ٹیس بن کر نہ اُٹھے، زہر نہ چھوڑا مجھ میں
ہر نیا واقعہ اک حادثہ تھا، ہر نئی بات
فالِ بد نکلی، کیا زخمِ دروں کو گہرا
ہر نئے موڑ پہ دنیا ہوئی ثابت وہ بساط
جس پہ انسان فقط مہرے ہیں الٹے سیدھے
پھر بھی وہ کون سا جادوُ ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی سے کہ نشاں بھی نہ ملیں؟

۲۵ مئی ۱۹۵۸ء

میرا نام

(مولانا آزاد کی روح سے معذرت کے ساتھ)

مفتیِ شہر کا ہے یہ فتویٰ
بعدِ تسبیح و حمدِ ربِّ اَنام
خالقِ شش جہت نے روزِ ازل
یوں مرتب کیا جہاں کا نظام
ایک ذرّہ بھی گر جگہ سے ہلے
گیتی بن جائے حرفِ استفہام
کوہ کو کوہ کی جگہ رکھا
بحر کو بحر کی جگہ، ہر کام
گردش مہر و مہ طلوع و غروب
اک سلیقہ سے یوں دیا انجام
آج تک عقل و فہم حیراں ہے!
ویسے ہی علم اور زباں کی زمام
ہاتھ میں صرف و نحو کے ہے فقط
لیکن اک شخص خود سری کا غلام
خود کو لکھتا ہے اخترالایمان
کورِ ذوق، ابن جہل، کودن، خام
مسخ کرتا ہے قاعدوں کی شکل
تا بگاڑے نہ یہ زباں کا قوام

ہم نے صرف اس کی سرزنش کے لیے
آج جاری کیا ہے، اپنا پیام
نام اس کا ہے اک سرے سے غلط
پیشہ اس کا زروئے شرع حرام
اس کے اس نام سے ہیں شرمندہ
اہلِ علم و زبان و فن کے امام
اس نے ڈالا زباں میں رخنہ
کشتنی بے شبہ ہے یہ حلاّم
شاعری گو ہے ایک فعلِ قبیح
اس میں کیا شہرت و بقائے دوام
لیکن اک مدّتِ مدید سے کچھ
صاحبِ کشف و صوفیائے کرام
چوں کہ مانوس شاعری سے رہے
سرمدؔ و رومیؔ ایسے غم آشام
زشت سے خوب کر گئے اس کو
اس لیے سب سنیں خواص و عوام
آج کے بعد ہر جگہ سے ہم
یوں قلم زد کریں گے اس کا نام
تذکرے، علم و فن کی تاریخیں
ذکر سے اس کے ہوں گی خالی تمام
سہو سے کبریا بچائے ہمیں
بر حبیبِ خدا درود و سلام

اے نگیں خاتمِ زمانہ کے
اے خداوند عصر والا تبار
لیجے خم کردیا سر تسلیم
آپ سے اور میں کروں تکرار
مجھ کو خُو ہے کہ میں وراثت کی
وہ وراثت کیا ہے جس نے فگار
لاش اٹھائے پھروں جہاں جاؤں!
میرے شانوں پہ آج تک ہے بار
اس وراثت کا جس میں ابن الوقت
سودا کرتے رہے سر بازار
ملک و ملت کا اور محبِ وطن
زہر دے کر کیے گئے بیمار
میرے شانوں پہ آج تک ہے بار
اس وراثت کا قوم کی تاریخ
بن گئی جس میں جھوٹ کا طومار
نام پاسنگ بھی نہیں ان کا
اے خداوند عصر والا تبار
دین ہے یہ بھی کچھ بزرگوں کی
میں سہی ابنِ جہل ہذیاں کار
لیکن اے مبلغ و اساسِ علم
گزرے جاتے ہیں یونہی لیل و نہار
میرے اس نام پر تو چونکے حضور

پر توجہ نہ دی کبھی زنہار
ہیں بہت ایسے لوگ بھی جن کے
نام تو ٹھیک ہیں، مگر اطوار؟
بیچتا ہے مدک، چرس، کوکین
روز ملتا ہے راہ میں غفار
ایک بدرالدجیٰ، ہیں برسوں سے
ایسے ہوتے ہیں شب کو جلوہ بار
شاہد و مے کی ان سے فرمائش
کیجیے، چٹکی بجی کہ سب تیار
کیسا موزوں ہوا ہے ان پر نام
بخشیے ان کو خلعت و دستار
بارِ خاطر نہ ہو تو یہ بھی کہوں
آپ کے دورِ ساتگیں میں خمار
چھوڑ کر میکدے، صراحی، جام
گندی گلیوں میں آیا پہلی بار
علمِ اخلاق پر بہت ہے زور
تھانے میں کنٹروں کا ہے انبار
یوں برائی مٹائی جاتی ہے
جڑ نہیں، کاٹتے ہیں برگ و بار!
طبعِ نازک پہ نام تو ہے گراں
ہاں مگر زندگی کی یہ رفتار
یہ زبوں حالی آدمیت کی

سانس جیسے ہے اک اُپی تلوار
صبح سے شام تک شکم ہی شکم
آدمی ہے مشین یا ہتھیار
بوزنہ، گوسفند، یا جیسے
اور حشرات الارض جن کا شمار
کرنے بیٹھیں تو صرف ہوں دفتر
ایسا ہی آدمی بھی ہے سرکار
آدمی، آدمی کہاں ہے ابھی
آدمی ہے ابھی فقط جاں دار
مدرسے، اصطبل، ادب گاہیں
ایک پیمانے کا ہے کاروبار
اے خداوندِ صرف و نحو، ابھی
یہ زمیں ہے لطافتوں کا مزار
توسنِ زیست ہے خرِ پالنگ
آنکھیں موندیں ہیں آپ جس پہ سوار!

جون ۱۹۵۸

نیا شہر

جب نئے شہر میں جاتا ہوں، وہاں کے در و بام
لوگ وارفتہ، سراسیمہ، دکانیں، بازار
بُت نئے، راہنماؤں کے، پُرانے معبد
حُزن آلود شفاخانے، مریضوں کی قطار
تار گھر، ریل کے پُل، بجلی کے کھمبے، تھیٹر
راہ میں دونوں طرف نیم برہنہ اشجار
اشتہار ایسی دواؤں کے ہر اک جا چسپاں
اچھے ہوجاتے ہیں ہر طرح کے جن سے بیمار
اس نئے شہر کی ہر چیز لبھاتی ہے مجھے
یہ نیا شہر نظر آتا ہے، خوابوں کا دیار
شاید اس واسطے ایسا ہے کہ اس بستی میں
کوئی ایسا نہیں جس پر ہو مری زیست کا بار
کوئی ایسا نہیں، جو جانتا ہو میرے عیوب
آشنا، ساتھی، کوئی دشمنِ جاں، دوست شعار

۲۶ فروری ۱۹۵۹

دعاء

اب نہ شوریدہ سری ہے، نہ امنگوں کا ہجوم
لب پہ فریاد، نہ تھرّاتے ہیں پلکوں پہ نجوم
اب نہیں اٹھتا مرے سینے میں آہوں کا دھواں
اب نہیں پڑتا سرِ راہ کوئی ایسا مکاں
جس کی دیوار کے سائے میں سحر گاتی ہو
گوشہ گوشہ سے جہاں بوئے چمن آتی ہو
اب نہیں نظریں بھٹکتیں کسی صورت کے لیے
اب نہیں رُکتے کسی در پہ عبادت کے لیے
کوئی بیٹھا ہے پسِ پردہ، نہیں ہوتا قیاس
میں بگولہ ہوں، مجھے اب نہیں ہوتا احساس
میرے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دِل کا مفہوم
گردشِ خون ہے، باقی ہے ہر اک شے معدوم
میری وہ آنکھیں تڑپتا تھا کبھی جن میں شباب
جو رہا کرتی تھیں اک درد کے مارے بے خواب
آج اس واسطے چہرے پہ ہیں، بینا کہلاؤں
آج اس واسطے بینا ہوں کہ سب دیکھتا جاؤں
تُم نے میرے لیے جس دن کی دعا مانگی تھی
یہ وہی روزِ قیامت ہے، مبارک ہو تمھیں!

۱۸ نومبر ۱۹۵۹

عمرِ گریزاں کے نام

عُمر یوں مجھ سے گریزاں ہے کہ ہر گام پہ میں
اس کے دامن سے لپٹتا ہوں مناتا ہوں اسے
واسطہ دیتا ہوں محرومی و ناکامی کا
داستاں آبلہ پائی کی سناتا ہوں اسے
خواب ادھورے ہیں جو دہراتا ہوں ان خوابوں کو
زخم پنہاں ہیں جو وہ زخم دکھاتا ہوں اسے
اس سے کہتا ہوں، تمنا کے لب و لہجے میں
اے مری جان مری لیلیٰ تابندہ جبیں
سنتا ہوں تو ہے پری پیکر و فرخندہ جمال
سنتا ہوں تو ہے مہ و مہر سے بھی بڑھ کے حسیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں کہ ابھی تک میں نے
جاننا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
صبح اٹھ جاتا ہوں جب مُرغ اذاں دیتے ہیں
اور روٹی کے تعاقب میں نکل جاتا ہوں
شام کو ڈھور پلٹتے ہیں چراگاہوں سے جب
شب گزاری کے لیے میں بھی پلٹ آتا ہوں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ملتوی کرتا رہا کل پہ تری دید کو میں

اور کرتا رہا اپنے لیے ہموار زمیں
آج لیتا ہوں جو ان سوختہ راتوں کا حساب
جن کو چھوڑ آیا ہوں ماضی کے دھندلکے میں کہیں
صرف نقصان نظر آتا ہے اس سودے میں
قطرہ قطرہ جو کریں جمع تو دریا بن جائے
ذرّہ ذرّہ جو بہم کرتا تو صحرا ہوتا
اپنی نادانی سے انجام سے غافل ہوکر
میں نے دن رات کیے جمع خسارہ بیٹھا
جانتا تجھ کو کجا پاس سے دیکھا بھی نہیں
اے مری جان مری لیلئ تابندہ جبیں
یوں نہ ہو مجھ سے گریزاں مرا سرمایہ ابھی
خواب ہی خواب ہیں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

۱۰ جنوری ۱۹۶۱

میر ناصر حسین

چرخِ نیلی فام ازل سے ہے جفا جُو کینہ ساز
اس کی آنکھوں میں نہیں اچھے بُرے کا کچھ لحاظ
ہم سے ان کو چھین لیتا ہے جو ہیں بے حد مفید
جن کو کہنا چاہیے ہر قفلِ بستہ کی کلید
میر ناصؔر جن کو کل برسی تھی، ایسے شخص تھے
یہ جہانِ سفلہ پرور نیست ہو، چاہے رہے
کتبۂ ایام پر کندہ رہے گا ان کا نام
اور ہم کرتے رہیں گے ان کا یونہی احترام
ایک رات، ان ہی دنوں کی بات ہے، میں پارسال
گھر میں چھپ کر پڑھ رہا تھا مثنوی خواب و خیال
جانے کس کو یہ سنا کہتے ہوئے دیکھو تو ہے
آج اس دارالمحن سے میر ناصؔر اٹھ گئے
مَوت نے پھینکی عروسِ زندگانی پر کمند
بیٹھے بیٹھے دِل کی حرکت ہوگئی یک لخت بند
سُن کے گھونسہ سا لگا، دِل نے کہا اے آسماں!
اب کہاں سے لائے گا تو ایسی نادر ہستیاں!
مجھ کو کیا اس مَوت کا ہر شخص کو صدمہ ہوا
سب رسائل اور اخبارات نے ماتم کیا
کچھ نے ان کو رہنما و ہادی و رہبر لکھا

کچھ نے لکھا، قوم کی کشتی کے وہ تھے نا خدا
کچھ نے غم کا یوں کیا اظہار اب دِل ہے دو نیم
وہ گئے کیا ہوگئی ہے ملّتِ بیضاء یتیم
شہر میں جلسے ہوئے سب نے کیا یہ اعتراف
میؔر صاحب جو بھی تھے، پر آدمی تھے دِل کے صاف
ان کے مرنے سے غرض ہر سو صفِ ماتم بچھی
مدّتوں محسوس کی جاتی رہی ان کی کمی
دھوم سے سوئم ہوا، دسواں ہوا، چہلم ہوا
مختصر یہ ہے شرارہ تیرگی میں گم ہوا
اے خدا پسماندگاں کو کر عطا صبرِ جمیل
ضبط کی توفیق دے ان کو جو ہیں غم سے قتیل

میر ناصؔر کو مرے گو ہوگیا کل ایک سال
ذہن میں باقی ہیں اب تک ان کے سارے خطّ و خال
لانبا قد، کچھ پھیلی پھیلی ناک تھی، چہرہ طباق
دہری کاٹھی، چال میں تھا اک عجب سا طمطراق
آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن سے جھانکتے تھے رست و خیز
بات کرتے تھے تو یوں لگتا تھا ہیں گرمِ ستیز
بلبلاتے تھے ہنسی کیا تھی مگر اک حُسن تھا
ان کی ہر اک بات میں، دلکش تھی ان کی ہر ادا
میں بھی ان کی بارگاہِ خوب میں تھا باریاب

اور اکثر ان کی باتوں سے ہوا ہوں فیض یاب
کہتے تھے میں آج کے اخلاق کی تصویر ہوں
آدمی کا خواب ہے یہ عہد، میں تعبیر ہوں
آج کی دنیا میں مجھ سا آدمی ہے کامیاب
صرف مجھ ایسوں کی ہوتی ہیں دعائیں مستجاب
آدمی معمولی خواندہ تھے، مگر بے حد ذہین
شور یا زرخیز ہے پہچانتے تھے ہر زمین
حلقۂ احباب میں شامل تھے ان کے بیشتر
مقتدر حکّام، ذی منصب سیاسی چارہ گر
شخصیت کوئی ہو اس کا ہو نہ ہو کچھ رابطہ
میرؔ صاحب سے براہ راست یا بالواسطہ
اس طرح ہوتا تھا جیسے دونوں ہوں شیر و شکر
سب پہ رکھتے تھے بڑی گہری محبت کی نظر
دعوتوں کا سلسلہ رہتا تھا گھر پر صبح و شام
اس قدر مخلص تھے خود کرتے تھے سارا اہتمام
قدر دانی میں نہ کی بھولے سے بھی کوئی کمی
دوستوں کے واسطے حاضر تھی ان کی جان بھی
مذہب و ملّت کی ان کے ہاں نہیں تھی کوئی قید
ہم نشینوں میں سبھی شامل تھے، راہلؔ، جانؔ، زیدؔ
شعر بھی کہتے تھے لیکن صرف اپنے واسطے
سنیے اک اک لفظ میں کیا کیا معانی ہیں چھپے

"آگ سے پکتا ہے کھانا بھاپ سے چلتی ہے ریل
بے وسیلے رچ نہیں سکتا کوئی دنیا کا کھیل
پیٹ سے بڑھ کر نہیں کوئی خدا، ایمان، دین
آدمی کے پاس گر پیسہ نہیں "کوڑی کے تین"
مختصر یہ ہے بہت سی خوبیوں کے شخص تھے
صلحِ کل مشرب رہا مرحوم کا جب تک جیے
ان کی اس نیت کا پھل یہ ہے کہ ان کے نور چشم
زندگی بھر جو رہے ان کے لیے اک وجہِ خشم
جن کی خاطر وہ بنے اکثر ملامت کا ہدف
جن کو دنیا یہ سمجھتی تھی کہ ہیں سب ناخلف
آج فضلِ ایزدی سے صاحبِ املاک ہیں
اچھے رتبوں پر ہیں فائز گو سراپا خاک ہیں
باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں وہ بھی آج
وہ بھی اب پہچانتے ہیں اس زمانے کا مزاج

قاعدہ ہے آدمی کا رتبہ بڑھ جاتا ہے جب
تذکرہ ہوتا ہے اس کا ہر طرح کا روز و شب
بعض لوگوں کو دکھائی دیتا ہے مشرق جنوب
ڈھونڈتے ہیں مرنے والے میں اگر کچھ تو عیوب
آج کل احباب کے حلقے میں ہے افواہ گرم
اس اچانک موت کا چرچا تھا اک دنیا کی شرم
اصلیت یہ ہے انہوں نے خودکشی کی تھی مگر

ان کے لڑکوں نے اڑا دی دِل کے دورے کی خبر
خود کشی کی وجہ کچھ اوقاف ہیں جن کی رقوم
مؔیر صاحب کے تصرّف میں رہی تھیں بالعموم
ایسے ہی کچھ بے سر و پا اور بھی الزام ہیں
لیکن ایسی ساری خبریں مفسدوں کے کام ہیں
خلوت و جلوت میں دیکھا میں نے ان کو بارہا
مدّتوں ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا
زندگی تھی ان کی سب کے سامنے اک وا کتاب
لمحے لمحے کا کوئی مانگے تو مِل جائے حساب
رہ گئی یہ بات وہ بالکل فرشتہ تھے، نہیں
عام لوگوں میں جو ہیں کمزوریاں ان میں بھی تھیں
خود کہا کرتے تھے مکروہات کا پتلا ہوں میں
سب ہیں جیسے ویسا ہی اللہ کا اک بندہ ہوں میں
اب کہاں پیدا ہیں ایسی ہشت پہلو ہستیاں
اہلِ حرص و آز سے معمور ہیں گھر بستیاں
آیئے پھیلائیں ان کے واسطے دستِ دعا
گڑگڑا کر یوں کہیں، اے مالکِ روزِ جزا
عاجز و کمتر ہیں بندے، تو ہے دانا اور علیم
تجز ترے پہچانتا ہے کون راہِ مستقیم
میر ناصؔر سے اگر کوئی خطا سرزد ہوئی
ایک ہی اس کا سبب ہے، دور بینی کی کمی

آدمی پُتلا خطاؤں کا ہے تو ہے نکتہ ور
اُن کو بحر عفو کی گہرائیوں میں غرق کر
کتبۂ ایام پر کندہ ہو ان کا نیک نام
اور ہم کرتے رہیں ان کا ہمیشہ احترام
"آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۰

مامن

بہار بھی آ کے جا چکی تھی، خزاں بھی گلشن سے جا رہی ہے
مگر وہ اک برگِ نا دمیدہ جو شاخ کے بطن میں ابھی ہے
وہ ایک پتّی جو کل اُگے گی، وہ ایک غنچہ جو کل کھِلے گا
اسے خبر کیا کہ ایک چھوٹی سی، ایک نازک سی شاخِ گُل نے
نہ جانے کتنی صعوبتوں سے، ہزار طوفان سے گزر کے
کیا ہے تخلیق اِس ثمن بر کو، اور یہ ساز گار دنیا
جہاں تمھارے شگفتہ ہونٹوں میں کھلتے پھولوں کی تازگی ہے
جہاں تمہارے حسین قامت میں نرم شاخوں کا لوچ سا ہے
اسے بھی ہموار کرتے کرتے لہو ہوا کتنے گُل رُخوں کا
یہاں کی ہر مُشتِ خاک پھولوں کا عطر ہے، رُوحِ برگِ گُل ہے
یہ مامنِ عشقِ رفتگاں ہے، زمیں کو نفرت سے یوں نہ روندو!

ستمبر ۱۹۵۶

کتبہ

دل ہے کہ اجاڑ کوئی بستی
ہر سمت مزار جا بہ جا ہیں
میں مرثیہ خواں نہیں کسی کا
لیکن وہ مزار لوح جس کی
شفاف ہے آئینہ کی مانند
کس کا ہے چلو نہ آؤ دیکھیں
ہَے ہَے کوئی طفلِ آرزو ہے
کم سِن ہے کلی ہے نَو دمیدہ!

۱۹ مئی ۱۹۶۱

فصل ۶

بنتِ لمحات، اشاعت ۱۹۶۹

پیش لفظ: اخترالایمان

رخشندہ کتاب گھر، بمبئی

وقت کی کہانی

یہ سامنے جو عمارت ہے بارہ منزل کی
علم بلند ہے جس پر کسی سفارت کا
یہاں نشاں تھے کبھی خلجیوں کی عظمت کے
اور اس کے بعد تصرّف میں تغلقوں کے رہی
یونہی بدلتی گئی ہاتھ، یہ امانت تھی
ہر آنے والے زمانے کے پاسبانوں کی
ہمارے طفلی کے ایام بھی ہیں دفن یہاں
پکڑتے پھرتے تھے، شامائیں، گرگلیں، گلدُم
کبھی کلیلیں کیا کرتے تھے ہرن کی طرح
کبھی درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے رہتے تھے
یونہی بلا کسی مقصد کے، بے خبر، پہروں
جھلتی دھوپ، خنک چاندنی تھی سب کے لیے
وہ یار کھوگئے گردابِ زیست میں سب آج
ہمارے پہلو میں جو بیٹھے تھے، جیسے صنم!

۱۲جنوری ۱۹۶۲

بے تعلقی

شام ہوتی ہے سحر ہوتی ہے، یہ وقتِ رواں
جو کبھی سنگِ گراں بن کے مرے سر پہ گرا
راہ میں آیا کبھی میری ہمالہ بن کر
جو کبھی عقدہ بنا ایسا کہ حل ہی نہ ہوا
اشک بن کر میری آنکھوں سے کبھی ٹپکا ہے
جو کبھی خونِ جگر بن کے مژہ پر آیا
آج بے واسطہ یوں گزرا چلا جاتا ہے
جیسے میں کشمکشِ زیست میں شامل ہی نہیں!

۲۵ جنوری ۱۹۶۲

ایک لڑکی کے نام

ہمارے بچّے، تمھارے بچّے
جو کل کی دنیا سے بے خبر ہیں
جو کل کی دنیا کے بال و پر ہیں
ہمارے دنیا سے اُن کی دنیا
حسین تر سے حسین ہو گی
بہشت کیا جو زمین ہو گی
ہماری آنکھوں سے جو نہاں ہے
وہ اُن پہ سب آشکار ہوگا
وہ اُن کی رہ کا غُبار ہوگا
ہمارے بچّے، تمھارے بچّے
نہ اجنبی ہوں گے ہم تھے جیسے
نہ پتّھروں کے صنم تھے جیسے
یہ کل کی دنیا کے جسم و جاں ہیں!

۲۸ جنوری ۱۹۶۲

تسکین

اک محقق نے انسان کو بوزنہ جب کہا
میں وہیں سجدۂ شکر میں گر گیا
اپنی کوتاہیوں، خامیوں کے لیے
آفرینش سے اب تک جو شرمندہ تھا
آج وہ بوجھ، بارے ذرا کم ہوا

۳ فروری ۱۹۶۲

کل کے بات

ایسے بیٹھے ادھر بھیا تھے دائیں جانب
ان کے نزدیک بڑی آپا شبانہ کو لیے
اپنی سسرال کے کچھ قصے، لطیفے، باتیں
یوں سناتی تھیں ہنسے پڑتے تھے سب
سامنے اماں وہیں کھولے پٹاری اپنی
منہ بھرے پان سے سمدھن کی انھیں باتوں پر
جھنجھلاتی تھیں کبھی طنز سے کچھ کہتی تھیں
ہم کو گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں نعیمہ، شہناز
وقفہ وقفہ سے کبھی دونوں میں چشمک ہوتی
حسبِ معمول سنبھالے ہوئے خانہ داری
منجھلی آپا کبھی آتی تھیں کبھی جاتی تھیں
ہم سے دور ابّا اسی کمرے کے اک کونے میں
کاغذات اپنے اراضی کے لیے بیٹھے تھے
یک بیک شور ہوا ملک نیا ملک بنا
اور اک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی، ٹھیرو، نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی!

۲۳مارچ ۱۹۶۲

لوگو اے لوگو

مری انتہائے محبّت مسرّت سوا اس کے کیا اور ہوگی
بجائے کوئی مسندِ عالیہ، تختِ طاؤس و زر مانگنے کے
بجائے کوئی سر برآوردہ پتّھر صفت شخصیت چاہنے کے
تمھاری معیت رفاقت، تگ و دو کا انداز مانگوں
یہ جمّ غفیر، ایک سیلِ رواں زندگی کا جو "لا" سے نکل کر
اسی "لا" میں پھر ڈوب جاتا ہے، یہ ریت ہے یونہی جاری
سمندر جو پھیلا ہے ہر چار جانب، افق سے افق تک
سمندر جو ہے آئینہ دارِ ہستی، جہادِ مسلسل، کشاکش
سمندر جو سفاک ہے اور طوفاں سے لبریز ہے، پُر جنوں ہے
سمندر جو بے باک ہے، جنم داتا ہے اور موت کا نغمۂ سرمدی ہے
یہ سیلِ رواں جو یونہی بہتا رہتا ہے اس سیل میں ڈوب جاؤں
میں جو اک قطرہ ہوں گہرائی گیرائی کا جزم کا اس کے بن جاؤں حصّہ
مجھے کوئی مکتی نہیں چاہیے کوئی نروان کی آرزو کوئی خواہش نہیں اب
کوئی سلسبیل اور کوثر، نجات و جزا، پُرسکوں کوئی لمحہ
نہیں، صرف امواج کی شورشِ رائیگاں چاہیے یہ اگر رائیگاں ہے؟

۲۷ اپریل ۱۹۶۲

بنتِ لمحات

تمھارے لہجے میں جو گرمی و حلاوت ہے
اسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ
غنیم نور کا حملہ کہو اندھیروں پر
دیارِ درد میں آمد کہو مسیحا کی
رواں دواں ہوئے خوشبو کے قافلے ہر سُو
خلائے صبح میں گونجی سحر کی شہنائی
یہ ایک کہرہ سا، یہ دھند سی جو چھائی ہے
اِس التہاب میں، اس سُرمگیں اجالے میں
سوا تمھارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
حیات نام ہے یادوں کا، تلخ اور شیریں
بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے
شفق کو قید میں رکھا، صبا کو بند کیا
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے، جیسے دشمن ہے
نہ تم ملو گی نہ میں، ہم بھی دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے جا کے جو واپس کبھی نہیں آتے!

۲۳ مئی ۱۹۶۲

باز آمد - ایک مُنتاج

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہے جو
کان میں کہنی ہے خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سُن کر یہ بات

دھوپ میں تیزی نہیں
ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دستِ شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا
اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے
جیسے میں نیند میں ہوں

عورتیں چرخے لیے بیٹھی ہیں
کچھ کپاس اوٹتی ہیں
کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں
جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس
ایک سے ایک چہل کرتی ہے
کوئی کہتی ہے مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکھاری مری ساس
کوئی کہتی ہے بھری چاندنی آتی نہیں راس

رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
بات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
لذّتِ وصل ہے آزار، کوئی کہتی ہے
میں تو بن جاتی ہوں بیمار، کوئی کہتی ہے
میں بھی گھس آتا ہوں اس شیش محل میں، دیکھو
سب ہنسی روک کے کہتی ہیں نکالو اس کو

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں
ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب
پوری قوّت سے کوئی گیند اچھالے جیسے
اک پھدکتا ہے سرِ شاخ پہ جس طرح کوئی
آمدِ فصلِ بہاری کی خوشی میں ناچے
گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے
نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں
اور گل ہاتھ ہوئی ہیں پیلے
کوئلیں کوکتی ہیں
جامنیں پکّی ہیں، آموں پہ بہار آئی ہے
ارغنوں بجتا ہے یکجائی کا
نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو ادھر
ساونی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملاکر ہرسُو
اور اس آواز سے گونج اٹھتی ہے بستی ساری
میں کبھی ایک کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں
ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں
آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر
کیوں حبیبہ نہیں آئی اب تک؟
کھلکھلا پڑتی ہیں سب لڑکیاں سن کر یہ نام

لو یہ سپنے میں ہیں، اک کہتی ہے
باؤلی سپنا نہیں، شہر سے آئے ہیں ابھی
دوسری ٹوکتی ہے
بات سے بات نکل چلتی ہے
ٹھاٹ کی آئی تھی بارات، چنبیلی نے کہا
بینڈ باجا بھی تھا، دیپا بولی
اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر
کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف
اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی، کہ نہیں
جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری؟
کیوں نہیں بہتی، چنبیلی نے کہا
اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے؟
وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی
وعدہ کرکے جو حبیبہؔ نہیں آتی تھی کبھی
آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جاکر
اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سوجاتا تھا

ماہ و سال آتے، چلے جاتے ہیں
فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے
کوئی روتا نہیں اس موقع پر
حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپاکر ڈھالیں

کوئی زنجیر نہ ہو !
زیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے !

بھیڑ ہے بچّوں کی چھوٹی سی گلی میں دیکھو
ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے
میں نے جا پکڑا اسے، دیکھی ہوئی صورت تھی
کس کا ہے، میں نے کسی سے پوچھا ؟
یہ حبیبہ کا ہے، رمضانی قصائی بولا
بھولی صورت پہ ہنسی آگئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے !
دیر تک ہنستے رہے!

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہے جو
کان میں کہنی ہے خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات !

۲۷ مئی ۱۹۶۲

مشورہ

میں نہ شاکی ہوں خدا کا، نہ ستم کاروں کا
بالا دستوں کا، نہ اغیار صِفت یاروں کا
فلسفی جس نے کہا فن ہے زمانہ سازی
جنگ و اُلفت میں کوئی فعل بھلا ہے نہ بُرا
مدعا اتنا ہے انسان نہ ہارے بازی
ہم نشانہ ہیں انھیں کیچوؤں کا، جن کے لیے
زندگی قحبہ ہے ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے
اُس حسینہ کا نہ اخلاق، نہ کردار کوئی
برف ہے برف، ذرا دیر میں گل جاتی ہے
ہم جو پیدا ہوئے مرتے ہوئے اخلاق کے ساتھ
جس کی لاش آج بھی کاندھوں پہ لیے پھرتے ہیں
سوچتے رہتے ہیں، یہ بوجھ کہاں لے جائیں
لوگ کہتے ہیں نہ تُم بدلو، نہ دنیا بدلے
اور مر جاؤ انھیں قدروں کو سینے میں لیے
وقت مرہم ہے بڑا، گہرے سے گہرا گھاؤ
ایسے بھرتا ہے، جہاں دیدہ معالج جیسے
تُم جو اُٹھ جاؤ گے دنیا نہیں سُونی ہوگی!

یکم جون ۱۹۶۲

احتساب

تو کیا تم نے یہ فیصلہ کر لیا، میں گنہ گار ہوں
چلو میں نے گردن جھکا دی، اٹھو میری مشکیں کسو
چوبِ خشک اور پُر خار سے باندھ کر تم مجھے ٹانگ دو
گشتنی ہوں تو جو بھی سزا چاہیے، دو مجھے
میں معلّم نہیں، درس و تدریس آتا نہیں کچھ مجھے
ایک سادہ سا انسان ہوں، یونہی بے مدعا، بے غرض
مرنے سے پہلے ایسی تمنا نہیں کوئی باقی مری
گر نہ پورا کرو تم زیاں کار ہو، سب ستم ساز ہو
ہاں مگر صرف اتنا بتا دو مجھے، یہ اساسِ جہاں
سنگِ بنیاد و ہر این و آں، رنگینی زندگی، ہر خوشی
کیا گناہوں پہ قائم نہیں، جن کا میں مرتکب آج ہوں؟
میں نے اِس آب و گِل، آفرینش کا جب جب تصور کیا
میں نے جب جب یہ سوچا کہاں سے یہ سب آگیا اور کیسے ہوا
ہر نئے موڑ پر مجھ کو شیطان و قابیل یاد آئے ہیں!

۳ جون ۱۹۶۲

ایک احساس

غنودگی سی رہی طاری عمر بھر ہم پر
یہ آرزو ہی رہی تھوڑی دیر سو لیتے
خلش ملی ہے مجھے اور کچھ نہیں اب تک
ترے خیال سے اے کاش درد دھو لیتے
مرے عزیزو، مرے دوستو، گواہ رہو
برہ کی رات کٹی آمدِ سحر نہ ہوئی
شکستہ پا ہی سہی، ہم سفر رہا پھر بھی
امید ٹوٹی کئی بار منتشر نہ ہوئی
ہیولی کیسے بدلتا ہے وقت حیراں ہوں
فریب اور نہ کھائے نگاہ، ڈرتا ہوں
یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے پَل پَل میں
ہزار بار سنبھلتا ہوں اور مرتا ہوں
وہ لوگ جن کو مسافر نواز کہتے تھے
کہاں گئے کہ یہاں اجنبی ہیں ساتھی بھی
وہ سایہ دار شجر جو سنا تھا راہ میں ہیں
سب آندھیوں نے گرا ڈالے اب کہاں جائیں
یہ بوجھ اور نہیں اٹھتا کچھ سبیل کرو
چلو ہنسیں گے کہیں بیٹھ کر زمانے پر!

ایک بات

کبھی دماغ میں آتی ہے بے سر و پا بات
یہ بات جب بھی کہی جاتی پھلجھڑی ہوتی
زمین چاند میں ہوتی، وہاں یہ ہوتی رسم
ہر اک کو اپنی جگہ اور کی پڑی ہوتی
روایتیں بھی نئی ہوتیں، فلسفے بھی نئے
زمین سینگ پہ گائے کے گر کھڑی ہوتی
وفا کا نام ستم ہوتا، غم کا راحتِ جاں
تمھاری ناک ذرا چھوٹی یا بڑی ہوتی

۴ جون ۱۹۶۲

اُمید

آسماں کے دامن میں
شب کے تیرہ آنگن میں
دیکھ کر ستاروں کو
رات کی بہاروں کو
سوچتا ہی رہتا ہوں
اپنے جی میں کہتا ہوں
میری صبحِ فردا بھی شاید ایسی روشن ہے
تارے ماند پڑتے ہیں
وقت بہتا جاتا ہے
شب کے تیرہ آنگن میں
چاند مُسکراتا ہے
نُور کا فرستادہ
برف کی طرح ٹھنڈا
دیکھ کر یہ منظر میں
سوچتا ہی رہتا ہوں
اپنے جی میں کہتا ہوں
میری صبحِ فردا بھی شاید ایسی روشن ہے

رات بھیگ جاتی ہے
ڈوبتے ستاروں کا
حُسن ڈھلنے لگتا ہے
چاند برف کا تودا
جیسے گلنے لگتا ہے
دُور شرق میں کوئی
دردِ زہ سے روتا ہے
کوکھ سے اندھیرے کی
نُور پیدا ہوتا ہے
صبح جنم لیتی ہے
دیکھ کر یہ منظر میں
سوچتا ہی رہتا ہوں
مضمحل تھکی آنکھیں
بند کر کے کہتا ہوں
میری صبحِ فردا بھی شاید ایسی روشن ہے

برندرا بن کی گوپی

تُم مرے ذہن میں یوں آتی ہو جیسے خوشبو
گیت جھرنوں کے، صبا، دُور کھنکتی چھاگل
بے خبر بہتی ہوئی ندیا، اُمنڈتی بدری
سات رنگوں کی دھنک، آنکھوں میں پھیلا کاجل
کُنج میں چھپ کے چہکتی ہوئی شاما کوئی
گُدگُدی، لوری، کوئی پیار میں بھیگا آنچل
جھیل ڈُوبی ہوئی جلووں میں اُبھرتے دِن کے
لاکھ طوفان اُٹھیں جس میں نہ جاگے ہلچل
تُم مری طفلی کا دیکھا ہوا اک خواب سا ہو
اک اُجالا ہو جو نظروں کو بھلا لگتا ہے
اک گھنی چھاؤں ہو بیٹھا ہوں جہاں میں پہروں
میں تمھیں جانتا ہوں، نام نہیں یاد آتا!

۱۳ جون ۱۹۶۲

ایک خط

(رامش کے نام گرمیوں کی چھٹیوں میں باہر جانے پر)

جس دِن سے گئے ہو گھر سے بیٹے
ساکت ہے زمیں خموش و حیراں
ہر چیز ہے گرد و پیش میرے
یہ گھوڑا بھی ہو گیا ہے بے جاں
گاڑی بھی وہیں کھڑی ہے اب تک
ہر چیز کو ہے تمھارا ارماں
یہ بیل جو مرکھنے تھے اتنے
نادیدہ جہان کے یہ بَونے
جو واقعی آج ہیں کھلونے
یہ شیر، یہ گائے، دیو چینی
دیواریں، یہ جنتِ زمینی
جینے کو ترس گئے بچارے
اَگن ' سننے کی آرزو کے مارے
اب آرزومند ہیں تمھارے
سب چاہتے ہیں مسیحا آئے
اِن سب میں حیات دوڑ جائے!

۱۶ جون ۱۹۶۲

بیٹے نے کہا

ایک شب خیز نے یہ سوچ کے اِس دُنیا کا
سلسلہ یوں ہے کہ جو باپ ہے بیٹا ہو وہی
اپنے ہمراہ لیا لختِ جگر کو اک رات
راہ ماری کے لیے چل پڑا تاریکی میں
دونوں چپ چاپ چلے جاتے تھے آگے پیچھے
جب نکل آئے بہت دُور تو اک سمت کہیں
باپ نے رُک کے کسی گھر کی طرف دیکھا، کہا
"وہ جو گھر ہے نا، دِیا رکھا ہے کھڑکی میں جہاں
میں نے اِس گھر کو کئی بار کیا ہے تاراج!"
سُن کے بیٹے نے کہا باپ سے، "لیکن بابا
پھر یہ کیوں ہے کہ اندھیرا ہے ہمارے گھر میں
اور اِس گھر میں ابھی تک بھی دِیا جلتا ہے؟"

کرمِ کتابی

یہ میں نے مان لیا تیرا ذہنی سرمایہ
کثیر دولتِ بیدار ہے عزیزِ من!
یہ میں نے مان لیا تیری تشنگیِ علم
کچھ اور، اور بھی کچھ، اور جاننے کی لگن
لیے پھری ہے کتب خانوں میں تجھے دن رات
وہ کرم خوردہ کتابیں، متاعِ شعر و سخن
وہ قلمی نسخے، وہ بوسیدہ شاہ پارے جنھیں
کبھی ہوا لگی شاید، نہ روشنی کی کرن
لئیمِ وقت نے جن کو چھپا دیا تھا کہیں
وہ نادرات جنہیں کھا گئی نمی، سیلن
جنھیں ملی ہے اماں صرف بند قفلوں میں
وہ گنج ہائے گراں مایہ جانِ فکر و فن
تمام نوکِ زباں پر ہیں، یہ مجھے تسلیم
کیا ہے تو نے انھیں جزوِ روح و جزوِ تن
مگر مجھے ہوا محسوس تجھ سے مِل کر یوں
کہ تو وہ پیلئہ ریشم ہے جس نے اپنا بدن
لپیٹ رکھا ہے کوئے میں ان نوادر کے
یہی کتابیں بنی جارہی ہیں تیرا کفن

کتاب راہ نما ہے، نہ منزلِ مقصود
یہ صرف نقشِ قدم ہے گزرنے والوں کا
نئے نقوش جنھیں محو کرتے رہتے ہیں
ہمارے ذہنوں سے، ہر روز اک شگوفہ نیا
یہاں پہ کھلتا ہے، یہ رسم ہے یونہی تازا
اوسائرسؔ، نہ زئیسؔ، آج کوئی زندہ نہیں
وہ روزنامچہ مُردوں کا، وہ عمل نامہ
جسے خداؤں نے لکھا تھا کھو گیا ہے کہیں
منوسمرتی، نہ توریت، سب وہ ہنگامہ
بگولہ بن کے اٹھا تھا جو، سوگیا ہے کہیں!
وہ سارے اعلیٰ قوانین جن کو شمسؔ نے خود
کیا حوالے حمورابیؔ کے، جلال کے ساتھ
تمام دھنس گئے دلدل میں وقت کی، جس کو
قرار ہی نہیں، اک لمحہ اُڑتا جاتا ہے
یہ رحم کھاتا نہیں آئیسسؔ، نہ اِشترؔ پر
جنھوں نے چاہا محبت کو لازوال کریں
میں ڈھونڈتا ہوں کہیں نکسلا نہ پاٹلی پتر
موہن جودارو، کہیں قرطبہ، نہ غرناطہ
نہ نینوا ہے، نہ بابل، نہ آج اندرپرستھ
یہ سب ہیں میرے لیے گویا خواب کی باتیں
میں ڈھونڈتا ہوں کتابیں جو ان میں دفن ہوئیں

مگر یہ وقت مرے ہاتھ ہی نہیں آتا
خدا بدلتے ہیں اصنام ٹوٹ جاتے ہیں
تمام عہد و فرامین خوردہ سال ہوئے
اگر ہے زندہ کوئی وقت کی طرح یہ لوگ
یہ لوگ خامیاں جن کی ہیں تیرے دِل کی جلن
یہ لوگ جن کو خدا بننے کی نہیں خواہش
یہ لوگ جن کی شبِ ماہ ہے، نہ صبح، چمن
یہ لوگ جن کی کوئی شکل ہے، نہ تاریخیں
ہنسی میں ڈھال کے جیتے ہیں یونہی رنج و محن
یہ لوگ، کم نظر آتے ہیں جو کتابوں سے
یہ لوگ اپنی دعاؤں، امیدوں کا مدفن
خدائے حاضر و غائب کی ہیں یہ وہ بھیڑیں
جنھیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبرانِ وطن
گزر رہے ہیں سبک گام تیری دنیا سے
جہاں تلاشِ معیشت ہے کربِ دار و رسن
نماز ایک کی ہے، کفر دوسرے کے لیے
کسی کی وجہ سکوں ہے کسی کے دِل کی چبھن
کسی کا رزق، کسی کے لیے پیالۂ زہر
جہاں زمیں نہیں اب تک کسی کا بھی مامن
یہ لوگ، جو ہیں ہر اک فن کا خام سرمایہ
انھیں سے باندھا ہے میں نے حیات کا دامن

یہ میں نے مان لیا علم ہے بڑی دولت
اگر کفن نہ بنے یہ تو کیا برائی ہے !

۲۸ جون ۱۹۶۲

کوزہ گر

کہیں قومیت ہے کہیں ملک و ملّت کی زنجیر ہے
کہیں مذہبیت کہیں حریت، ہر قدم پر عناں گیر ہے
اگر میں یہ پردہ ہٹادوں جسے لفظِ ماضی سے تعبیر کرتے رہے ہیں
اگر میں حدودِ زمان و مکاں سب مٹا دوں
اگر میں یہ دیواریں جتنی کھڑی ہیں گرا دوں
تو ہر قید اٹھ جائے، یہ زندگی جو قفس ہے
یونہی دیکھتے دیکھتے تیلیاں سب بکھر جائیں اس کی
اور انسان اپنے صحیح روپ میں ہر جگہ دے دکھائی
کسی غار کے منہ پر بیٹھا، کسی سخت الجھن میں غلطاں
کہیں شعلہ دریافت کرنے کی خواہش میں پیچاں
کہیں زندگی کو نظام و تسلسل میں لانے کا خواہاں
جہاں کو حسیں دیکھنے کی تمنا میں کوشاں
زمیں دور تک ایسے پھیلی ہوئی ہے
کشادہ کوئی خوانِ نعمت ہے جیسے
جہاں کوئی پہرہ نہیں، کوئی تخصیص و تفریقِ انساں
یہ سب کی ہے سب کے لیے ہے یہاں سب ہیں مدعو!

میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو بانیِ شر ہے
جو رشیوں، رسولوں کی محنت کو برباد کرتا رہا ہے
میں اس شخص کو ڈھونڈتا ہوں جو ہر دور میں بے محابا
نئے بھیس میں سامری بن کے آتا ہے اور موہتا ہے دلوں کو
اسے ڈھونڈتا ہوں میں جس نے ہر اک خوانِ نعمت پہ پہرے لگائے
زمیں کو زمیں سے الگ کردیا سینکڑوں نام دے کر
اجارہ کی بنیاد ڈالی، کیا جاری پروانۂ راہ داری
بجائے حسین اعلیٰ قدروں کے تاسیسِ عالم
رکھی مصلحت پر، مفادات پر، خود پرستی پہ ساری
اور انسان کو خام اشیاء میں تبدیل کر کے
بہت پہلے اس سے کہ انسان انسان بنتا
اسے ایک شطرنج کا چوبی مہرہ بنا کر
مقابل کھڑا کردیا ایک کو دوسرے کے

کہاں ہے وہ قوّت، وہ ہستی جو یوں عصر کی رُوح بن کر
فضاؤں کو مسموم کرتی ہے، لاشوں سے بھردیتی ہے خندقوں کو
میں للکارتا ہوں اسے وہ اگر اتنا ہی جادوگر ہے
تو سورج کو مشرق کے بدلے نکالے کبھی آکے مغرب سے اک لمحہ بھر کو
ہواؤں کی تاثیر بدلے، پہاڑوں کو لاوے میں تبدیل کر دے
سمندر سکھا دے، ہر اک جلتے صحرا کو زرخیز میداں بنادے
اصولِ مشیّت بدل دے، زمین آسمانوں کے سب سلسلے توڑ ڈالے
مگر میں اسے کیسے للکار سکتا ہوں، یہ تو خدا ہے

حیات و نمو کی وہ قوت، تغیر، جو خود سامری ہے
یہ وہ کوزہ گر ہے جو خود مسخ کرتا ہے چہرے بنا کر
یہ وہ کوزہ گر ہے اسی ایک مٹی کو ہر بار متھ کر
بنا کر نئے ظرف رکھتا ہے کچھ دیر شیشوں کے پیچھے سجا کر
انھیں خود ہی پھر توڑ دیتا ہے، سب ظرف کوزے قوانین اخلاق سارے

جہاں اتنی شکلیں بنائی بگاڑی ہیں یہ زندگی کا نیا بت بھی اک دن
فراموشگاری کے اس ڈھیر میں پھینک دے گا جہاں ایسی کتنی ہی چیزیں پڑی ہیں
کہ یہ چاک تو چل رہا ہے یونہی آفرینش سے، گردش میں ہے اور رہے گا!

۷ جولائی ۱۹۶۲

قبر

عجم کے شہروں میں اک شہر کا ہے یہ قِصّہ
یہ رفت و بود کا اک سِلسلہ جو قائم ہے
بھنور میں جس کے ہر اک چیز ڈوب جاتی ہے
سُنا ہے اس میں کسی قصبہ کا رئیس بڑا
پھنسا کچھ ایسا کوئی چال کارگر نہ ہوئی
ہر ایک طبّی مددؔ، ہر دوا، علاج، غرض
وہ سب جو قبضۂ انسان و ممکنات میں تھا
کیا، تمام مسیحا قریب و دُور جو تھے
طلب کیے گئے، سب کو زرِ کثیر دیا
مگر خُدا کو جو منظور تھا وہ ہو کے رہا
اجل نے بیٹے سے محبوب باپ چھین لیا
خبر یہ پھیل گئی دُور، پاس پل بھر میں
ہر ایک روتا تھا زار و قطار سُن سُن کر
پسر کے تَن کا دِل پر اثر شدید ہوا
وہ سینہ پیٹ کے کہتا تھا بار بار، "پدر
چلے ہو ایسی جگہ چھوڑ کر ہمیں سب کو
جہاں نہ دوست، نہ ہمدم، نہ کوئی مونس ہے
اندھیری کوٹھری ہو گی، اکیلے رہنا ہے

نہ کھانا پانی جہاں ہے، نہ روشنی کا گزر
وہاں پہ جیسے بھی گزرے گی خود ہی سہنا ہے
ہر ایک چیز کو ترسو گے ہائے ہائے وہاں
کوئی مدد کو نہ آئے گا، ایسی دُنیا ہے"
غریب بھی کوئی شامل تھا اُس جنازے میں
اور اپنے نُورِ نظر کو بھی ساتھ لایا تھا
سُنی جو آہ و بُکا اُس نے کچھ نہیں سمجھا
پلٹ کے باپ سے پوچھا بہت ہی سادگی سے
ہمارے گھر لیے جاتے ہیں کیا انھیں بابا؟
۱۹ جولائی ۱۹۶۳

اذیت پرست

میں بظاہر جو بہت سادہ ہوں، بے حس نظر آتا ہوں تمہیں
ایسا دریا ہوں جہاں سطح کے نیچے چپ چاپ
موجیں شوریدہ ہیں، طوفان اٹھا کرتے ہیں
ٹھیرا پانی ہوں، مگر اس میں بھنور پڑتے ہیں
زخم سب اپنے چھپائے ہیں ہنسی کے پیچھے
صرف اس واسطے شانوں پہ ردائے تہذیب
ڈالے رہتا ہوں کہ حیواں نہ کہے کوئی مجھے
وہ ثقافت جسے کہتے ہیں، اثاثہ، ورثہ
سالہا سال کی محنت ہے جو انسانوں کی
میرے اک فعل سے غارت نہ کہیں ہو جائے
ورنہ تم سامنے آتی ہو تو سر سے پا تک
دوڑ جاتی ہے کبھی آگ سی، تیزاب سا اک شعلہ سا
تم کو معلوم ہے اس دوَر میں میرے دن رات
صرف اس واسطے بامعنی ہیں تم سامنے ہو
تم کو معلوم ہے یہ گردشِ ایام مجھے
کیوں بھلی لگتی ہے، کیوں دیکھ کے تم کو آنکھیں
مسکرا اٹھتی ہیں، میں شاد نظر آتا ہوں
میں جو اس پھیلی ہوئی دنیا میں یوں جیتا تھا

جیسے یہ بستی نہیں، شہر ہے اک لاشوں کا
جس میں انساں نہیں، مُردے ہیں کفن پہنے ہوئے
اور ان مُردوں میں لب سوختہ، میں بھی ہوں کہیں
تم نے احساس دلایا نہیں، میں لاش نہیں
اپنی گفتار کی گرمی سے حرارت بخشی
منجمد خون کو دوڑا دیا شریانوں میں
کھینچ لائیں مجھے، تنہائی کی دنیا سے یہاں
میں الف لیلہ کا کردار نہیں ہوں کوئی
تم بھی افسانوی محبوبہ، نہیں اور نہ تھیں
پھر روایاتی ستم کیوں کیا تم نے مجھ پر؟
خود ہی وارفتہ ہوئیں، کھنچ گئیں خود ہی ایسے
جیسے میں واقعی اک لاش ہوں چلتی پھرتی
اب تمھیں دیکھ کے میں دِل سے دعا کرتا ہوں
لاش بن جاؤں میں، سچ مچ ہی، یہ بیگانہ روی
یہ نیا طرزِ وفا، تم نے جو سیکھا ہے ابھی
کچے شیشے کی طرح ٹوٹ کے ریزہ ہو جائے
اور تم مجھ سے ہر اک خوف کو ٹھکراتے ہوئے
چیخ کر ایسے لپٹ جاؤ، کلیجہ پھٹ جائے!

۲۱ جولائی ۱۹۶۲

منکہ فُلاں ابنِ فُلاں

تُم مِلی ہو جس دِن سے
میرے کتنے ہی لمحے
ایسی فکر میں گزرے
کاروبار دُنیا کا
ایسے چلتا رہتا ہے
کچھ ہیں جو ستم کش ہیں
کچھ ہیں جو ستم راں ہیں
کوئی چاند کی جانب
چاہتا ہے اُڑ جائے
آسماں زمیں کا سب
ٹھیک فاصلہ جانے
کُچھ ہیں جو سمندر کی
موجِ بے کراں سے بھی
نام کو نہیں خائف
اور اُس میں غلطاں ہیں
اُس کی تھاہ پا جائیں
کُچھ ہیں جو ہمالہ کے
برف سے ڈھکے پردے
چاہتے ہیں اُٹھ جائیں

منتظر ہوں لیکن میں
اُس غریب پرور کا
آدمی کو جو سمجھے
کاش کوئی تو ناپے
غم کی انتہا کیا ہے؟

۲۱ جولائی ۱۹۶۲

فاصلہ

ہوائیں لے گئیں وہ خاک بھی اُڑا کے جسے
کبھی تمھارے قدم چُھو گئے تھے اور مَیں نے
یہ جی سے چاہا تھا دامن میں باندھ لوں گا اُسے
سُنا تھا میں نے کبھی یوں ہوا ہے دُنیا میں
کہ آگ لینے گئے اور پیمبری پائی!
کبھی زمیں نے سمندر اُگل دیے لیکن
بھنور ہی لے گئے کشتی بچا کے طوفاں سے
میں سوچتا ہوں پیمبر نہیں اگر نہ سہی
کہ اتنا بوجھ اُٹھانے کی مُجھ میں تاب نہ تھی
مگر یہ کیوں نہ ہوا غم مِلا تھا دُوری کا
تو حوصلہ بھی مِلا ہوتا سنگ و آہن سا
مگر خُدا کو یہ سب سوچنے کا وقت کہاں؟

۲۶ جولائی ۱۹۶۲

ساتویں دِن کے بعد

غرض نقشِ ثانی ہوا جب مکمل تو دیکھا خُدا نے
کہا خود سے ہی زیر لب مُسکرا کر کہ، اچھا ہے
اور آدمی کو جو تنہائی کا ایک احساس تھا مِٹ گیا
بوئے گُل کی طرح، چاند کی ضَو کی مانند، نغموں کی صورت
چلے دونوں گُل گشت کے واسطے اور باغِ جناں
آج تک جو فضول ایک تخلیق تھی، ایک جنگل تھا خود رَو
چمن ساز کی قوّتِ صانعہ کا کرشمہ بنا
مَوجِ تسنیم و کوثر بنی راحتِ جاں فزا
اور پھر یوں ہوا وقت جیسے گزرتا گیا
ایک احساس پھر سے اُبھرنے لگا دونوں ہیں اجنبی
پھر وہی پہلی تنہائی شدّت سے محسوس ہونے لگی
دونوں کو پھر کہیں سے یہ تحریک ملنے لگی، وہ شجر
جس کو چُھونے کی بالکل اجازت نہیں، آخرش ہے وہ کیا
اور یہ جاننے کے لیے دونوں بے چین اِتنے ہوئے
سخت تنبیہ کے بعد بھی چھپ کے ممنوعہ پھل کھا لیا
زلزلہ سا اُٹھا، کھاتے ہی دونوں کے ہوش جاتے رہے
اور جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ آغوشِ جنت نہیں
پاؤں سے تا جبیں، دونوں عریاں ہیں، چاروں طرف ہے زمیں

دَوڑ کر جسم پتّوں سے ڈھانپے، لگے سوچنے کیا کریں
ایسے دِن ڈھل گیا، رات نے لے لیا دونوں کو اپنی آغوش میں
آسمانوں سے دیکھا خُدا نے، کہا مسکرا کر کہ 'اچھا ہے'
اور عرش سے رُوحِ انسان میں آ گیا، دُوسرا ساتواں دِن ہوا!!

یکم اگست ۱۹۶۲

بے چارگی

ہزار بار ہوا یوں کہ جب امید گئی
گلوں سے رابطہ ٹوٹا، نہ خار اپنے رہے
گماں گزرنے لگا ہم کھڑے ہیں صحرا میں
فریب کھانے کی جا رہ گئی، نہ سپنے رہے
نظر اُٹھا کے کبھی دیکھ لیتے تھے اُوپر
نہ جانے کون سے اعمال کی سزا ہے کہ آج
یہ واہمہ بھی گیا، سر پہ آسماں ہے کوئی

۴ اگست ۱۹۶۲

خُود فریبی

رفتگاں بچھڑے نہیں، وقفہ ہے اک تھوڑا سا
وصل اور ہجر کے مابین، ابھی ثانیہ بعد
جس کو گر سوچیے بَن جاتا ہے صدیوں کا فراق
اُن سے مِل جائیں گے ہم جن کی مُلاقات ہے سعد
حشر کچھ دُور نہیں، وقت ہے کوندے کی لپک
اور یہ دُوری، یہ اک کرب سا بے حدّ و حساب
دائمی وصل میں، قُربت میں، بدل جائے گا
یوں بھی بہلاتے ہیں وارفتہ طبیعت جی کو
ایسا ہوتا ہے کہ غم یوں بھی غلط کرتے ہیں

۵ اگست ۱۹۶۲

دو پربت

نہ میں ہی کرتا ہوں شکوہ کبھی تغافل کا
نہ بے نیازی کی وہ مجھ سے وجہ پوچھتے ہیں
کچھ ایسا رہتا ہے انداز جب بھی ملتے ہیں
نگاہیں کہتی ہیں ٹھہرو، قدم مُصر کہ چلیں
اُنھیں بھی کام نہیں کوئی، ویسے عُجلت ہے
مُجھے بھی ڈھیر سے ہیں کام، ویسے فرصت ہے
یونہی گزرتے چلے جا رہے ہیں لیل و نہار
ہمارا اُن کا یہی سلسلہ ہے برسوں سے!

۱۵ دسمبر ۱۹۶۲

نادیدہ

یہ بات جاننے کو
میں کتنا مضطرب تھا
پردے کے پیچھے کیا ہے
لیکن رخِ زلیخا
آنکھوں نے جونہی دیکھا
شوقِ شکیب پیما
اک دُوسرا جو پردا
حائل تھا درمیاں وہ
اُس کو ہٹانے فوراً
دیوانہ وار لپکا!

۴ مئی ۱۹۶۲

دوسرا سوال

شاباش، جواب ٹھیک ہے تمہارا
دانستہ ہوا، کہ بے اِرادہ
ہم ہی نے معاشرت کی بنیاد
لالچ پہ اُٹھائی، خوف پر رکھی ہے
اعمال بھلے ہوئے تو پاؤ جنّت
اعمال بُرے ہوئے تو پھر جہنّم
اعمال بھلے ہیں گر تو حوریں
اعمال بُرے، زقوم و حنظل
بنیے کی کتاب ہے یہ دُنیا
اور سُود ہے نیکیوں کا عُقبٰی
ایک اور سوال اب بتاؤ
کیوں ایک کے بعد ایک منسوخ
ہوتی رہیں مذہبی کتابیں
کیوں آدمی جانور ہے اب تک؟
۳ اگست ۱۹۶۲

نیند کی پریاں

خیال بھی نہیں لا سکتا اب اُنھیں واپس
دُھلی دُھلی سی جبینیں، کِھلا کِھلا سا چمن
تمام عارض و رخسار و لب کا، باتوں میں
نہ کوئی حرف تسلّی کا اور نہ وعدہ کوئی
کہیں کسی جگہ ملنے کا ایک ہی انداز
ہم اپنے آپ میں بیٹھے ہیں چھُپ کے ڈھونڈو ہمیں!

۲۸ اپریل ۱۹۶۲

معمول

ہر روز بدل جاتے جینے کے تقاضے، دِن رات
یوں آتے ہیں پیرہن بدل بدل کے جیسے یہ کوئی
نو وارد اجنبی ہے، پہلی بار آیا ہے یہاں
خوشنودی ہے اِس کی صرف میرا مرنا جینا
ہر روز سحر کو شام کر دیتا ہوں اس کوشش میں
یہ بوجھ، حیات نے جو رکھ دیا ہے مُجھ پہ، سر سے نہ گرے
ہر روز میں خود کو توڑتا ہوں جیسے میں کوئی
بے رُوح و مزاج ایک شے ہوں کچّی مٹّی کی بنی!

۲۰ اپریل ۱۹۶۵

تفاوت

ہم کتنا روئے تھے جب اک دن سوچا تھا ہم مر جائیں گے
اور ہم سے ہر نعمت کی لذّت کا احساس جدا ہوجائے گا
چھوٹی چھوٹی چیزیں، جیسے شہد کی مکھّی کی بھِن بھِن
چڑیوں کی چُوں چُوں، کوّوں کا ایک اک تنکا چننا
نیم کی سب سے اونچی شاخ پہ جاکر رکھ دینا اور گھونسلہ بُننا
سڑکیں کوٹنے والے انجن کی چھک چھک بچّوں کا ڈھول اُڑانا
آدھے ننگے مزدوروں کو پیاز سے روٹی کھاتے دیکھے جانا
یہ سب لایعنی، بیکار مشاغل بیٹھے بیٹھے ایک دَم چھِن جائیں گے
ہم کتنا روئے تھے جب، پہلی بار یہ خطرہ اندر جاگا تھا
اس گردش کرنے والی دھرتی سے رشتہ ٹوٹے گا ہم جامد ہوجائیں گے
لیکن کب سے لب ساکت ہیں دِل کی ہنگامہ آرائی کی
برسوں سے آواز نہیں آئی اور اس مرگِ مسلسل پر
اِن کم مایہ آنکھوں سے اک قطرہ آنسو بھی تو نہیں ٹپکا!

۶ اگست ۱۹۶۵

نراج

خوب چلاؤ گلا پھاڑو سب
پنبہ درگوش ہے زیست
ہم بندھے بیٹھے ہیں خود اپنی ہی تاویلوں میں
زور سے بولے تو ناموسِ وفا جائے گی
لب ہلائے تو ہر اک کہنہ روایت، رشتے
سالہا سال کی تاریخ کے تابندہ سنہری اوراق
یوں بکھر جائیں گے اک پرزہ مِلے گا نہ کہیں
خواجہ نے ایسی بہت باتیں اُڑا رکھی ہیں
خود کو محصور کیے بیٹھا ہے اک گنبد میں
جیسے یہ شیشے کا انسان ہے بے روح و صدا
ہم مگر خواجہ نہیں، ڈر ہمیں کس بات کا ہو
ذرّہ جب ٹوٹا تھا تخلیق ہوئی تھی یہ زمیں
پنبہ درگوش ہے زیست
سانس کی نالی کو اک دھونکنی سمجھو، چیخو
اتنا چلاؤ کہ اک شور سے بھر جائے فضا
گونج الفاظ کی کانوں میں دھواں سا بن جائے
اک دھنی روئی سی بن جائیں عقائد سارے
فلسفے، مذہب و اخلاق، سیاست، سارے

ایسے گُتھ جائیں ہر اک اپنی حقیقت کھو دے
ایسا اک شور بپا کر دو کوئی بات بھی واضح نہ رہے
ذرّہ جب ٹوٹا تھا تخلیقِ زمیں سے پہلے
ابتری پھیلی تھی، واضح نہ تھی کچھ بھی، ہر شے
اک دُھنی روئی کی مانند اُڑی پھرتی تھی
خود کو کم مایہ نہ سمجھو، اٹھو توڑو یہ سکوت
پھر نئے دَور کا آغاز ہو تاریکی سے !

۲۹ اگست ۱۹۶۵

سبزۂ بیگانہ

حسب نسب ہے نہ تاریخ و جائے پیدائش
کہاں سے آیا تھا، مذہب نہ ولدیت معلوم
مقامی چھوٹے سے خیراتی اسپتال میں وہ
کہیں سے لایا گیا تھا وہاں یہ ہے مرقوم
مریض راتوں کو چلاتا ہے، "مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک، نکالو اسے،
گلو گرفتہ ہے یہ حبس دم ہے خائف ہے
ستم رسیدہ ہے، مظلوم ہے، بچا لو اسے"
مریض چیختا ہے، درد سے کراہتا ہے
یہ ویت نام، کبھی ڈومنیکن، کبھی کشمیر
زرِ کثیر، سیہ قومیں، خام معدنیات
کثیف تیل کے چشمے، عوام، استحصال
زمیں کی موت، بہائم، فضائی جنگ، ستم
اجارہ داری، سبک گام دِل رُبا، اطفال
سرود و نغمہ، ادب، شعر، امن، بربادی
جنازہ عشق کا، دف کی صدائیں، مُردہ خیال
ترقی، علم کے گہوارے، روح کا مدفن
خدا کا قتل، عیاں زیرِ ناف زہرہ جمال

تمام رات، یہ بے ربط باتیں کرتا ہے
مریض سخت پریشانی کا سبب ہے یہاں
غرض کہ جو تھا شکایت کا ایک دفتر تھا
نتیجہ یہ ہے اسی روز منتقل کر کے
اسے اک اور شفا خانے کو روانہ کیا
سنا گیا ہے وہاں نفسیات کے ماہر
طبیب حاذق و نبّاض ڈاکٹر کتنے
طلب کیے گئے اور سب نے اتفاق کیا
یہ کوئی ذہنی مرض ہے، مریض نے شاید
کبھی پرندہ کوئی پالا ہوگا لیکن وہ
عدم توجہی یا اتفاق سے یونہی
بچارہ مر گیا، اس مَوت کا اثر ہے یہ
عجیب چیز ہے تحتِ شعور انساں کا
یہ اور کچھ نہیں، احساسِ جرم ہے جس نے
دل و دماغ پہ قبضہ کیا ہے اس درجہ
مریض قاتل و مجرم سمجھتا ہے خود کو!
کسی کی رائے تھی، پس ماندہ قوم کا اک فرد
مریض ہوگا، اسی واسطے یہ قومیں
غریب کے لیے اک ٹیبو بن گئیں افسوس
کوئی یہ کہتا تھا یہ اصل میں ہے حبِّ وطن
مریض چاہتا تھا، ہم کفیل ہوں اپنے

کسی بھی قوم کے آگے نہ ہاتھ پھیلائیں
یہیں پہ تیل کے چشمے ہیں، وہ کریں دریافت!
گمان کچھ کو تھا یہ شخص کوئی شاعر ہے
جو چاہتا تھا جہاں گردی میں گزارے وقت
حسین عورتیں مائل ہوں لطف و عیش رہے
قلم کے زور سے شہرت ملے زمانے میں
زرِ کثیر بھی ہاتھ آئے اس بہانے سے
مگر غریب کی سب کوششیں گئیں ناکام
شکستِ پیہم و احساسِ نارسائی نے
یہ حال کردیا، مجروح ہوگئے اعصاب
غرض کہ نکتہ رسی میں گزر گیا سب وقت
وہ چیختا ہی رہا درد کی دوا نہ ملی
نشست بعد نشست اور معائنے شب و روز
انھیں میں وقت گزرتا گیا، شفا نہ ملی
پھر ایک شام وہاں سرمہ در گلو آئی
جو اس کے واسطے گویا طبیبِ حاذق تھی
کسی نے پھر نہ سنی درد سے بھری آواز
کراہتا تھا جو خاموش ہوگیا وہ ساز

برس گزرگئے اس واقعہ کو، ماضی کی
اندھیری گود نے کب کا چھپا لیا اس کو

مگر سُنا ہے شفا خانے کے در و دیوار
وہ گرد و پیش جہاں سے کبھی وہ گزرا تھا
خرابے، بستیاں، جنگل، اُجاڑ راہگذار
اسی کی چیخ کو دہرائے جا رہے ہیں ابھی
"کوئی مداوا کرو ظالمو مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے یہ حبس دم ہے خائف ہے
ستم رسیدہ ہے مظلوم ہے بچا لو اسے"

۲۹ ستمبر ۱۹۶۵

بیداد

کہیں بھی کندہ نہیں میری آہ میری فغاں
نہ تیرے قہقہے، جھنکار چوڑیوں کی، خرام
نہ سانحے، نہ حوادث، جنھوں نے روحوں کو
لہولہان کیا، آگ میں جلایا تمام
نہ داد خواہ کوئی ہے نہ داد گر کوئی
فضا میں گونج رہا ہے فقط خدا کا نام

۱۴ جون ۱۹۶۶

رابطہ

تمھارے شہر میں رونق بہت ہے، چاروں طرف
نئے مکان، دفاتر، دُکانیں لاتعداد
بنے ہیں ایسے کہ گویا زمیں سے پھوٹے ہیں
ہما ہمی کی نگر باسیوں کی عُمر زیاد
حسیں بہت ہیں مگر اُن میں کوئی تُم سا نہیں
جو اجنبی رہے، تنہائی دُور کر جائے
جواں بہت ہیں مگر اُن میں کوئی مُجھ سا نہیں
تمھارا ہوتے ہوئے، تُم سے بھی گزر جائے

۱۹ جون ۱۹۶۶

مفاہمت

جب اس کا بوسہ لیتا تھا سگرٹ کی بُو نتھنوں میں گھُس جاتی تھی
میں تمباکو نوشی کو اک عیب سمجھتا آیا ہوں
لیکن اب میں عادی ہوں، یہ میری ذات کا حصّہ ہے
وہ بھی میرے دانتوں کی بدرنگی سے مانوس ہے، ان کی عادی ہے
جب ہم دونوں ملتے ہیں، لفظوں سے بیگانہ سے ہو جاتے ہیں
کمرے میں کچھ سانسیں اور پسینے کی بُو، تنہائی رہ جاتی ہے!
ہم دونوں شاید مُردہ ہیں، احساس کا چشمہ سوکھا ہے
یا پھر شاید ایسا ہے یہ افسانہ بوسیدہ ہے
دردِ زِہ سے زیست یونہی ہلکان تڑپتی رہتی ہے
نئے مسیحا آتے ہیں اور سولی پر چڑھ جاتے ہیں
اک مَیلا انسان صفوں کو چیر کے آگے بڑھتا ہے اور منبر سے چلاّتا ہے
ہم مصلوب کے وارث ہیں یہ خون ہمارا ورثہ ہے
اور وہ سب آدرش، وہ سب جو وجہ ملامت ٹھیرا تھا
اس مَیلے شخص کے گہرے معدے میں کھُپ جاتا ہے
پھر تفسیروں اور تاویلوں کی شکل میں باہر آتا ہے
یہ تاویلیں مجبوروں کا اک موہوم سہارا ہیں
یا شاید سب کا سہارا ہیں
یونہی میں آدرش انسان کا جویا ہوں

سب ہی سپنے دیکھتے ہیں خوابوں میں ہوا میں اڑتے ہیں
پھر اک منزل آتی ہے جب پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں
شاخوں کی طرح ٹوٹتے ہیں
اک روحِ جان و دِل کو جو دنیا میں سب سے بڑھ کر ہے پا لیتے ہیں
پھر اس سے نفرت کرتے ہیں گو پھر بھی محبّت کرتے ہیں!

میں اس سے نفرت کرتا ہوں وہ مجھ کو نیچ سمجھتی ہے
لیکن جب ہم مِلتے ہیں تنہائی میں تاریکی میں
دونوں ایسے ہو جاتے ہیں جیسے آغشتہ مٹّی ہیں
نفرت ضم ہو جاتی ہے اک سنّاٹا رہ جاتا ہے
سنّاٹا تخلیقِ زمیں کے بعد جو ہر سُو طاری تھا
ہم دونوں ٹوٹتے رہتے ہیں جیسے ہم کچّی شاخیں ہیں
خوابوں کا ذِکر نہیں کرتے دونوں نے کبھی جو دیکھے تھے
خوشیوں کا ذکر نہیں کرتے جو کب کی سپردِ خاک ہوئیں
بس دونوں ٹوٹتے رہتے ہیں
میں بادہ نوشی پر مائل ہوں، وہ سگرٹ پیتی رہتی ہے
اک سنّاٹے کی چادر میں ہم دونوں لپٹے جاتے ہیں
ہم دونوں ٹوٹتے رہتے ہیں جیسے ہم کچّی شاخیں ہیں!

۱۴ مئی ۱۹۶۷

بُزدِل

کوئی کارواں سا گزرتا چلا جا رہا ہے
ابھی رُک گیا دفعتاً شہر کی تنگ گلیوں میں جا کر
وہ پردے کے پیچھے بھری پھولوں کی ٹوکری سی دھری ہے
کہیں صحن میں زیر دامن کوئی جوت سی جل رہی ہے
کہیں ایک نغمہ سا کہتا ہے، 'اللہ ٹھہرو! سنو تو!
یہی پردہ داری تو سب کچھ ہے، اِس طرح دامن نہ کھینچو!'
قفس تو نہیں ہے کہیں بھی مگر ویسے محبوس ہیں ہم
یہ آداب ہیں سارے ہر ایسے قدغن سے مانوس ہیں ہم
مگر میں نے خود سے کہا مت الجھنا بہت کام ہیں زندگی میں
زیاں جی کا ہے ایسی درماندگی میں

کوئی کارواں سا گزرتا چلا جا رہا ہے
مرے دونوں ہاتھوں میں چہرہ ہے اک ایسی لڑکی کا جس کا تموّل
بلا کچھ کہے پوچھتا ہے مسلسل تمھاری ذہانت
اس اک لطفِ گفتار تک ہے کہ اِس سے کبھی اور آگے بڑھے گی؟
بتاؤ مُجھے، کر سکو گے، مرے دین و دِل، جسم و جاں کی حفاظت؟
سراسیمہ ہو کر میں چاروں طرف دیکھتا ہوں
چمکتی ہوئی اُس کی پیشانی کو چُوم کر اُس سے کہتا ہوں، اے جانِ راحت

وہ دیکھو، وہ تنہا ستارہ جو ہے آسماں کی بلندی پہ روشن
علامیہ ہے وہ ہماری ہی خوشیوں کا، اُس کی ضمانت
یہ لمحات ہیں جن میں ہم دونوں بہتے چلے جا رہے ہیں
مجھے اپنے ماضی سے آواز آتی ہے اکثر، 'بھگوڑے ٹھہر جا'
مگر اپنے الفاظ کھا کر میں چُپ ہو گیا اور پلٹا نہیں اُس طرف پھر
کوئی کیوں اعادہ کرے اپنے کمزور قدموں کا آخر؟

کوئی کارواں سا گزرتا چلا جا رہا ہے
مرے پاس اک نازنیں بیٹھی کچھ کہہ کے خود زیر لب ہنس رہی ہے
بڑی مدھ بھری رات ہے، موتیے کی مہک اُس کے جُوڑے میں یوں بس گئی ہے
کہ جیسے یہ بالوں کا گچھا نہیں، پھول ہیں ادھ کھلے، سوئے جاگے
اچانک وہ جھک جاتی ہے بے کہے اور کچھ میرے آگے
اور اپنے لبوں کو مرے ہونٹوں پر ایسے رکھ دیتی ہے
جیسے یہ تھا ابھی میرے دِل کا تقاضا
عذاب و گنہ کا تصور مرے ذہن سے یوں چمٹ جاتا ہے جیسے یہ کھنکھجورا ہے کوئی
مجھے جسم اک سُوکھی لکڑی کا کُندہ نظر آنے لگتا ہے، جس کو
جہنّم کی گہرائی میں پھینکا جائے گا، جس کی طوالت ہے ستر برس کی مُسافت
بدن ایک پژمردہ پتّی سی بن کر سمٹ جاتا ہے، دفعتاً میں
بہانہ بنا کر نکل آتا ہوں، ناگہانی تھی جیسے کوئی سر پہ آفت
یہ محسوس کرتا ہوں میں، تیز قدموں سے چلتے ہوئے، کر رہا ہوں ملامت
کسے؟ خود کو؟ حالات کو یا کسی اور کو، ذہن میں کچھ نہیں اب!

کوئی کارواں سا گزرتا چلا جا رہا ہے

مرے ہاتھ میں ایک موباف ہے، چند اُلجھے ہوئے بال ہیں ایک عورت کے سر کے

کہیں تھوڑے مسلے ہوئے پھول بھی ہوں گے جن کو حفاظت سے رکھا ہے میں نے!

میں اب سوچتا ہوں کسی نے مری راہ روکی، نہ دامن ہی پکڑا، نہ بانہوں میں جکڑا

میں اب سوچتا ہوں وہ الفاظ تھے سارے جن میں کہیں کوئی شدت نہیں تھی

وہ منہ دیکھی باتیں تھیں جن میں گھنی چھاؤں جیسی محبت نہیں تھی

میں اب سوچتا ہوں، مگر سوچ سے گھاؤ کیسے بھرے گا، یہ سب داغ میں کیا کروں گا؟

نہیں! میں انھیں، جن کے دامن پہ میرا لہو ہے، انھیں سب کو میں آج رُسوا کروں گا

۱۴ جولائی ۱۹۶۷

میری آواز

ملائکہ مری آواز سُن رہے ہو تُم؟
سُنی ہے پہلے بھی تُم نے ضرور یہ آواز
بہت لطیف تھی، شیریں تھی، اس میں نرمی تھی
شگفتگی تھی، یقیں تھا، بلند حوصلگی تھی
کھنک تھی اس میں، توانائی اور گرمی تھی
یہ آج خشک ہے، بے جان اور بے رس ہے
تھکی تھکی سی ہے، مجرُوح اور بے بس ہے

ملائکہ مری آواز سُن رہے ہو تُم؟
خُدا نے چھین لیں بیساکھیاں بھی انساں سے
پیمبر اب نہیں آتے، زمین بانجھ ہوئی
تمام سلسلے تہذیب و ضبط کے جو تھے
وہ سارے ٹوٹ گئے، زندگی تڑپتی ہے
اک ایسے درد سے جو دردِ زہ نہیں شاید!
ملائکہ دلِ ایذا طلب نہیں ہارا
مگر مشین کی معیاد ہے، کبھی نہ کبھی
اک ایسا وقت تو آتا ہے جب نہ ہو یارا
کسی بھی بات کا، در باز ہی نہ ہو کوئی

غنیمِ وقت بھی ہے سامری صفت گویا
تمام کُہنہ مسائل ہیں بُوں کے تُوں پھر بھی
ہر ایک شخص ہے مصروف یاوہ گوئی میں
اندھیرگردی کو کہنے لگے ہیں آزادی

مَیں رونا چاہتا ہوں، کِس پہ روؤں لیکن میں؟
اس ایک بات پہ ظالم ہے سرخرو، مظلوم
جواب مانگنے جائے تو اور رُسوا ہو
فساد اور بڑھے، ہو اگر بِنا معلوم
اس ایک بات پہ مقتل بنا ہے شہر کا شہر
مگر بیان سے بڑھ کر کوئی سبیل نہیں
کوئی غریب کا حاجت روا، کفیل نہیں
کسی کے سامنے معصوم کی اپیل نہیں
سخنوروں پہ روؤں جن کے سامنے اس وقت
تمام مسئلے بے جان ہیں سِوا اس کے
جو چائے خانوں سے چھوٹیں تو بُھوکی آنکھوں سے
زنانِ شہر کے پستان ناپیں یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیر ناف بال گِنیں

ملائکہ مری آواز سُن رہے ہو تُم؟
سُنی تھی پہلے بھی تُم نے ضرور یہ آواز

مگر وہ پہلی سی معصومیت نہیں ہے آج
تمام کرب زمانے کا بھر گیا اس میں
جو زہر زیست میں ہے، سب اُتر گیا اس میں!

۱۹ اپریل ۱۹۶۸

درد کی حد سے پرے

درد کی حد سے پرے کوئی نہیں جا سکتا
درد کی حد سے پرے، سوچ لو تم، کچھ بھی نہیں
ایک سناٹا ہے، احساس کی، ادراک کی مَوت
یہ کُرہ، گھومتی پھرتی یہ ستم کوش زمیں
خاک اور آب کا اک گولا ہے، بے رونق سا
آؤ چھپ جائیں، چلو مَوت کے ڈر سے بھاگیں
تُم مری بانہوں میں، مَیں زلفوں میں چھپ جاؤں یہیں
اور اُس درد کا اظہار کریں
زندگی جس سے عبارت ہے تمام
درد کی حد سے پرے، سوچ لو تم، کچھ بھی نہیں
گرمیِ عشق، یہ بوسوں کی حرارت، یہ سگند
جو پسینے میں ہے، یہ جھرجھری جو تم نے ابھی
سینے کو چھونے سے لی، سب یہ سمو لینے کی بھوک
جسم کے ٹوٹنے، اک نشہ میں گھل جانے کا رَس
رنگ میں، نغموں میں، اور لمس میں ڈھلنے کی ہوس
سال، صدیاں، یہ قرن، ماہ، یہ لمحے، یہ نفس
کیف، بہجت، خوشی، تسکین، مسرّت، سب کچھ
سب یہ اس واسطے ہے، درد ہے ساتھی ہر وقت

درد پیمانہ ہے ہر چیز کا اس دُنیا میں
زیست اک واہمہ ہے، ذات کے ہونے کا گُماں
درد کی حد سے پرے کچھ بھی نہیں جس کا نشاں
درد کی حد سے پرے، سوچ لو تم، کچھ بھی نہیں
ایک سناٹا ہے، احساس کی، ادراک کی موت
درد کی حد سے پرے کچھ بھی نہیں، جان کہیں
درد کی حد سے پرے کوئی گیا بھی تو نہیں!

۱۶ مئی ۱۹۶۸

جِگولو

زمیں اپنے محور پہ گردش میں ہے حسبِ دستور یونہی
برق کے قمقمے جگمگانے لگے شہر میں، لالٹینوں کے بدلے
پکّی سڑکوں کا اک جال سا بچھ گیا، بگّیوں کی جگہ موٹریں آگئیں
مشرقی پیرہن کی جگہ کوٹ پتلون اب عام ہے ہر طرف، ہر جگہ
بیٹھنے، اُٹھنے، کھانے، پہننے کے دیرینہ آداب و اطوار سب اُٹھ گئے
اور اعدادِ مردم شماری بتاتے ہیں آبادی پہلے سے کچھ دس گنی ہو گئی
گلیوں، بازاروں، سڑکوں پہ میلا لگا رہتا ہے رات دن، ہر گھڑی
ہاجرہ اپنی کھڑکی میں بیٹھی مگر صبح سے شام تک، رات تک
وفا نام کی چیز کو ڈھونڈتی رہتی ہے اپنی آنکھوں سے اس بھیڑ میں
اس ستم جو کی ہے منتظر جس نے اک روز آ کر بہت پیار سے کان میں کچھ کہا
اپنی چاہت کا ایسا بھلاوا دیا، ہاجرہ نے اسے اپنا سب دے دیا
(ہاجرہ کی ذرا ناک لمبی ہے، چہرے پہ چیچک کے کچھ داغ ہیں اور قد چھوٹا ہے)
اور جب باپ کی جائداد اور ورثہ سے محروم کر دی گئی، ایک دن دفعتاً
عشقِ صادق کا پُتلا کچھ اس طرح غائب ہوا جیسے اُس کا کبھی کچھ نشاں ہی نہ تھا!

۱۰ جولائی ۱۹۶۸

زندگی کا وقفہ

رات سناٹے کی چادر میں پڑی ہے لپٹی
بتیاں سڑکوں کی سب جاگ رہی ہیں جیسے
دیکھنا چاہتی ہیں شہر میں کیا ہوتا ہے
میں ہمیشہ کی طرح، ہونٹوں میں سگرٹ کو دبائے
سونے سے پہلے خیالات میں کھویا ہوا ہوں
دن میں کیا کچھ کیا، اک جائزہ لیتا ہے ضمیر
ایک سادہ سا ورق نامۂ اعمال ہے سب
کچھ نہیں لکھا، بجز اس کے پسے جاؤ یونہی
کچھ نہیں لکھا، بس اک اتنا کہ انساں کا نصیب
گیلی، گوندھی ہوئی مٹی کا ہے اک تودہ سا
دن میں سو شکلیں بنا کرتی ہیں اس مٹی سے
کچھ نہیں لکھا، بس اک اتنا کہ چیونٹی دَل ہے
جوق در جوق جو انسان نظر آتے ہیں
دانہ لے کر کسی دیوار پہ چڑھنا، گرنا
اور پھر چڑھنا، چڑھے جانا یونہی شام و سحر
کچھ نہیں لکھا، بس اتنا کہ پسے جاؤ یونہی
اور اندوہ، تاسف، خوشی آلام، نشاط

خود کو سو ناموں سے بہلاتے رہو، چلتے رہو
سانس رُک جائے جہاں، سمجھو وہیں منزل ہے
اور اس دوڑ سے تھک جاؤ تو سگرٹ پی لو!

۲۵ ستمبر ۱۹۶۸

شیشہ کا آدمی

اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں
ہماری عمر کا اک اور دن تمام ہوا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
زباں سے کلمہ حق راست کچھ کہا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کا دن بھی
اسی طرح سے کٹا، منہ اندھیرے اٹھ بیٹھے
پیالی چائے کی پی، خبریں دیکھیں، ناشتہ پر
ثبوت بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے
بخیر و خوبی پلٹ آئے جیسے شام ہوئی
اور اگلے روز کا موہوم خوف دِل میں لیے
ڈرے ڈرے سے ذرا بال پڑ نہ جائے کہیں
لیے دیے یونہی بستر میں جا کے لیٹ گئے

یکم دسمبر ۱۹۶۸

فصل ۷

نیا آہنگ، اشاعت ۱۹۷۷

انتساب!

میری زندگی کے حادثوں میں سب سے بڑا حادثہ امجد، شہلا، شاداب اور احلم --جو تین مہینے بعد ہونے والی تھی -- کا موٹر کا حادثہ ہے۔ ان کے بچ جانے کو میں ان کی زندگی کا نیا آہنگ سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب، نیا آہنگ، میں ان کی نئی زندگی کے نام معنون کرتا ہوں۔

اخترالایمان

پیش لفظ: اخترالایمان

مطبوعہ: رخشندہ کتاب گھر، بمبئی

پکنک

سماں سہانا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے
بدن کو تازگی مِلتی تھی، روح میں جیسے
اِضافہ ہوتا سا محسوس ہو رہا تھا مجھے
فَضا میں اُڑتے ہوئے مست ابر کے ٹکڑے
یہ لگ رہا تھا بہاروں کے ہیں فرستادے
خیال آیا کہ موسم کا لطف لیں سب دوست
مرے تو جاتے ہیں جینے کو، آج کھُل کے جئیں
عظیم شہر کی آلودہ اس فَضا سے پرے
کہیں بھی مِل کے چلیں، ساتھ بیٹھیں، کھائیں پئیں
مرا پڑوسی، بڑا پیارا آدمی تھا، اُسے
گلی میں آن کے آواز دی، "غلام رسُول"
معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
اب اِس جہاں میں کہاں، بن چُکا ہے وقت کی دھُول
جو پچھلے سال اچانک بھڑک اُٹھے تھے یہاں
وہ فرقہ واری فسادات کھا گئے اُس کو

میں -- ایک سیّارہ

میں کہاں جاؤں گا اس رات کے بعد
تم سے اس تشنہ ملاقات کے بعد
کوئی بھی میرا گرو، پیر، برہمن، ملا
راہ دکھلائے گا آفات کے بعد
یا سیاسی کسی رہبر کی عنایات کے بعد
کوئی بُت، کوئی خدا، کوئی عقیدہ لے کر
ڈھیر سی گردشِ حالات کے بعد
میں کہیں بیٹھ رہوں گا تھک کر

کتنے ہیں جینے کی بے تھاہ لگن ہے جن میں
اپنے ذہنوں میں پری خانے سجا رکھے ہیں
سینکڑوں قلعے بنا رکھے ہیں
پکتے لاوے کی طرح شورشِ جذبات کے بعد
عزمِ قلزم لیے موجوں کی طرح اٹھتے ہیں
اور اجاروں کے سواحل سے جو ٹکراتے ہیں
اداروں سے جو بھڑ جاتے ہیں
کچے شیشوں کی طرح ٹوٹ کے رہ جاتے ہیں
اس فراوانیِ نغمات کے بعد

زندگی کیسے کریں گے یہ بُھلا دیں یکسر
اور اک دوسرے میں درد کا درماں ڈھونڈیں
جینے کا ساماں ڈھونڈیں
اور کیا چاہیے الطاف کی سوغات کے بعد

اس جہاں کا یہ نیَم ہے کہ بڑے چھوٹوں کو
ہضم کر جائیں بنا لیں انھیں خوراک اپنی
بنا لیں انھیں پوشاک اپنی
کتنے ظلمات ہیں ظلمات کے بعد

جس نے آواز اٹھائی وہ ہوا نذرِ ستم
جو مسیحائی کو آیا رسَن و دار مِلی
ہر نیا دن نئے آفات کا مظہر ٹھہرا
صبحِ خوں گشتہ مِلی شامِ سرافگار مِلی
اب کہاں جائیں گے ہم قبلۂ حاجات کے بعد

دورِ جمہور میں کیا کیا ہوئی بیداد لکھیں
کوئی حقیقت تو کہیں :
بادشاہوں کے سے انداز میں کچھ لوگوں نے
حکم بھیجا ہے بدل ڈالوں میں اندازِ فغاں
طرزِ تحریر و بیاں

رسمِ خط اپنی زباں
اور کیا باقی ہے اس طرفہ کرامات کے بعد
عقل دشمن ہے بڑی چھین کے مہتاب کی حور
دے گئی اک لق و دق دشت سا بے برگ و طیور
اب کہیں کچھ بھی نہیں ایک تری ذات کے بعد
حلقہ در حلقہ سوالات کے بعد
پھر وہی صحرا سا اک پھیلا پڑا ہے آگے
اک ہمالہ سا کھڑا ہے آگے
زندگی کیسے کریں جینے کا انداز ہو کیا؟
جس کا انجام خوش آیند ہے آغاز ہو کیا؟
ہم کہاں جائیں گے اس رات کے بعد!
غم کہاں جائیں گے اس رات کے بعد!

۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء

مُداوا

یہ جو ہے اک چٹان سی، دریا میں پھینک دیں
دریا کے موتی وسعتِ صحرا میں پھینک دیں
صحرا کی ساری ریت کو بستی پہ ڈال دیں
اور اپنے دِل سے ہر غمِ فردا نکال دیں
سب اپنے اپنے جھنڈے نصب کر دیں اِس جگہ
گر ہم کبھی پلٹ کے یہاں آئے اور اِس
صحرا کی زندہ ریت نے بستی کو کھا لیا
سب اپنے جھنڈے ہر جگہ لہراتے پائیں گے
ہم اُن کی نیچے پُرکھوں کی قبریں بنائیں گے!

۲۲ اگست ۱۹۷۰

عروس البلاد

وسیع شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے
بسوں کے شور میں ریلوں کی گڑگڑاہٹ میں
چہل پہل میں بھڑوں جیسی بھنبھناہٹ میں
کسی کو پکڑو سرِ راہ مار دو چاہے
کسی عفیفہ کی عصمت اتار دو چاہے!
وسیع شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے!

عظیم شہر بڑے کاموں کے لیے ہیں میاں
وزیرِ اعلیٰ کی تقریر، لیڈروں کے جلوس
سیاستوں کے مظاہر، خلوص بہر خلوص
یہ رت جگوں کی جگہ، ناؤ نوش کا گڑھ ہے
یہ تم سے کس نے کہا علم و ہوش کا گڑھ ہے

ابھی ابھی شہ قفقاز آئے ہیں دیکھو
معززینِ عروس البلاد سب مِل کر
سپاس نامہ انھیں اس طرح کریں گے پیش
کہ جیسے دِل کی کلی پھول ہوگئی کھِل کر
پھر اس کے بعد کسی بینک کے بڑے کرتا

کوئی سفیر کسی دیش کے نئے مکھیا
مشیر صنعتی منصوبہ بندیوں کے لیے
جشن ثقافتی آئینہ سازیوں کے لیے
بڑے پلان، بڑی یوجنا، بڑی باتیں
ضیافتیں، بڑے ہوٹل، بڑی بڑی گھاتیں!
عظیم شہر بڑے کاموں کے لیے ہے میاں!

یہاں مزار ہیں ان کے بھی جن کے نام نہیں
سنہری شہر کی تسخیر کرنے آئے تھے
انھیں شکم سے بہت دور آگے جانا تھا
وہ اس جہان کی تعمیر کرنے آئے تھے!
بڑے دماغ تھے، طبّاع تھے، ذہین تھے سب
مگر سیاستِ دنیا میں کمترین تھے سب
عظیم شہر بڑے کاموں کے لیے ہیں میاں

شکستِ دل کوئی راکٹ ہے جو دکھائی دے
عظیم شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے!

۱۱ ستمبر ۱۹۷۰

قدرِ مشترک

شہر سب ایک سے ہوتے ہیں، کہیں
قحبہ خانے ہیں بہت، اور کہیں
رہ نما ڈھیر سے یا لوگ جرائم پیشہ
مختصر یہ ہے کہ بے چاری یہ اللہ کی زمیں
اپنی گردش کے علاوہ بھی ہے مجبور بہت

۱۵ جولائی ۱۹۷۱

نظم کی تلاش

وہ احساسِ زیاں ہے، جو کوئی کانٹا ہو جیسے، یوں کھٹکتا ہے
تبرّک جان کر میں نے لیا جو زندگی سے ایک صدقہ تھا
کہ ہم بے مایہ لوگوں کی نظراس کو نہ لگ جائے
کوئی اس پر نہ حرف آئے!
مرے سب مہرباں لیّام فربہ گائیں یا گیہوں کی بالیں ہیں
جنھیں میں نے مقفّل کر لیا گودام میں اپنے
اور اب دہلیز پر بیٹھا کفِ افسوس ملتا ہوں
لئیمِ نیک خُو کی طرح سو پہلو بدلتا ہوں
متاعِ رائیگاں ہے خرقۂ و پوشاکِ نورانی
بہت بے چین کرتی ہے مجھے میری تن آسانی
تفکّر جو بھٹکتی مشک بُو کا ایک جھونکا تھا
تخیّل جو کوئی آوارہ بادل تھا اُڑا جاتا تھا بے پروا
اُسے میں نے سماجی برتری کی دوڑ میں جانے کہاں چھوڑا؟
یہ، ایسے اور کتنے ہی ملامت خیز اندیشے
بسااوقات ایسے گھیر لیتے ہیں مجھے آ کر
کہ میں آوارہ بادل مشک بُو کے رفتہ جھونکے کے تعاقب میں نکلتا ہوں
یونہی بے سمت چلتا ہوں
بسوں کے تیل سے مسموم ہر گنجان آبادی میں جاتا ہوں

مسلسل چیونٹیوں کی فوج سی جو برقی ریلوں کے سٹیشن پر
نظر آتی ہے اس میں کود جاتا ہوں
عبادت گاہوں، چالوں، اسپتالوں، قحبہ خانوں میں
میں اس آوارہ بادل، مشک بو کی کھوج کرتا ہوں
مگر مجھ کو بجز درماندہ انسانوں کے کچھ بھی تو نہیں مِلتا
جو میری طرح لایعنی تگ و دو سے پریشاں ہیں
جو میری طرح زندانِ شبانہ روز کے مجبور قیدی ہیں
جو سب اک دوسرے کا رزق ہیں اور زہر ہیں دونوں
میں ان سب کے لیے ان کی دعائے مغفرت کو ہاتھ اٹھاتا ہوں
اور اپنی روح کے ہر کرب کو تسکین دیتا ہوں
تھپک کر مختلف ناموں سے، پہلو میں سُلاتا ہوں
خدا کی برتری کے گیت گاتا ہوں
اور اس ناآفریدہ نظم کی بے سمت سی اک جستجو میں چل نکلتا ہوں!

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱

آثار قدیمہ

برتن، سکّے، مہریں
بے نام خداؤں کے بُت ٹوٹے پھوٹے
مٹّی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکّی چولھے
کُند اوزار زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار جنھیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہلک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مرجاتا ہے؟

شاہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد تو کب کی بیٹھ گئی ہے
کلچر کا پرچم لے کر چلنے والے شاعر اور مورّخ اپنی اپنی گور میں چپ لیٹے ہیں
ریشم اور کتاں، مہ پاروں کی آرائش کے ساماں کی اب چاہ نہیں کچھ
سوداگر اپنے اپنے ملکوں کی یہ مصنوعات نہیں لے جاتے
مہلک انساں کُش ہتھیاروں کا سودا کرتے ہیں
برق صفت طیاروں کی ایجاد بھی کام نہیں آئی کچھ
دِلّی سے لاہور کے بازاروں کا فاصلہ پہلے سے کچھ اور بڑھا ہے
عشق کی سب راہیں ویران ہوئیں اب ہر جا خاک اُڑتی ہے
جابر شاہوں کے تابوت ان کی قبروں میں گل کر خاک ہوگئے سب
لیکن ان کی روحیں دوسرے جسموں میں در آئی ہیں

کوچہ کوچہ قاتل مشعل لے کر گھوم رہے ہیں
گیسوں اور مہلک ہتھیاروں کی فیکٹریاں عاشق کی آنکھوں کی صورت جاگ رہی ہیں
خوش قامت بانکے چھیلا، سب ایک مجسّم شہوت بنتے جاتے ہیں
اور حسینوں کے اندام بھی فضلے کے ڈبّوں کی صورت کھلے ہوئے ہیں
ہم کو زندہ رہنا ہے، جب تک موت نہیں آتی اک زہر پیے جانا ہے
آؤ چلو کتّوں کا دربار سجائیں کوّوں کی بارات نکالیں!

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱

میرا دوست - ابوالہول

دھواں دھار تقریر جس نے ابھی کی تھی وہ آدمی ہے
جو لفظوں کے پُل باندھتا ہے
اُبھرتے ہوئے نوجوانوں کو وعدوں کی افیون دے کر
اسی پُل پہ لاتا ہے اور غرق کر کے
پلٹ جاتا ہے حسبِ دستور آرام گہ کو

یہ دنیا تو ان شعلہ سامان لوگوں نے آپس میں تقسیم کر لی
جو ہتھیار کی شکل میں رنج و غم ڈھالتے ہیں
یا گولہ بارود کے کارخانوں کے مالک ہیں
یا پھر ثناخواں ہیں اُن کے
ہمارے لیے صرف نعرے بچے ہیں
صنعتی دَور کے کج کلاہوں کی داد و دہش روح پرور ہو یا جان لیوا
مگر زندہ باد، آفریں، مرحبا کے سوا کچھ نہیں پاس اپنے
یہ سب جانتا ہے ہماری شجاعت کی پرواز کیا ہے
ہماری جواں مردی اک صوبہ جاتی تعصّب سے
یا فرقہ واری فسادات سے آگے کچھ بھی نہیں ہے
فتوحاتِ اسکندری ہم نے تختی پہ لکھ کر مٹا دی ہیں کب کی
ہمارے بہادر زمیں کے تلے سو رہے ہیں

عجائب گھروں میں لٹکتی ہیں تلواریں اُن کی
اور اُن کے زرّیں لبادوں کو گھُن کھا گیا ہے
زرہ بکتروں پر کلونس آ گئی ہے
یہ سب جانتا ہے ہماری تگ و تاز کیا ہے
ہمارے شکم گر ہمارے سروں پر نہ ہوتے
اور چہروں میں اعضائے جنسی
تو ہم اچھے انسان بنتے
ہمارے گھروں کے کم و بیش سب عقبی دروازے پیہم کھُلے ہیں
ہمارے لہو میں ہرے لال پیلے بہت سارے پرچم گھُلے ہیں
کہیں سے مگر حق کی آواز آتی نہیں ہے
ہماری زباں دِل کی ساتھی نہیں ہے
ہمارے لیے کھوکھلا لفظ جمہوریت ہے، تقاریر ہیں لیڈروں کی
ہمارے لیے روزناموں کے صفحات ہیں، اشتہارات ہیں نیم جنسی
ہمارے لیے دیوتاؤں کے بُت ہیں، خدا کے فرامین ہیں اور عقبیٰ
جو بدرنگ ہے حال کی طرح اور کورے لٹھے کی بُو سے بھری ہے
ہمارے لیے صرف روٹی کی جدّ و جہد
عورتوں کے برہنہ بدن کی تمنّا سے آگے کہیں کچھ نہیں ہے
ہماری رگوں میں جو تیزاب ہے اس کی شدّت کبھی کم نہ ہو گی!

۲۴ فروری ۱۹۷۱

پیمان

اِس سے پہلے کہ گویائی طاقت گنوا دے
سامعہ، شامّہ، لمس، احساس کھو دیں
مہرباں مہرباں نہ رہیں، رُوٹھ جائیں
بصارت بدل جائے، بے نُور آنکھیں ڈبو دیں
اس سے پہلے کہ ہم سے یہ سب ہم سفر چھوٹ جائیں
درد کے سارے رِشتے، تواں ناتواں، ٹُوٹ جائیں
ہم یہ پیمان کر لیں، یہی رابطے، واسطے، والہانہ
بے سروپا، بلا ربط کے، احمقانہ
ہم یونہی جاری رکھیں گے، یہ عشق مرنے نہ دیں گے
تیرگی کے بھیانک کنویں میں اُترنے نہ دیں گے!

۷ ستمبر ۱۹۷۲

راہِ فرار

اِدھر سے نہ جاؤ
اِدھر راہ میں ایک بوڑھا کھڑا ہے
جو پیشانیوں اور چہروں
پہ ایسی بھبھوت ایک مَل دے گا سب جھرّیاں پھٹ پڑیں گی
سیہ، مار جیسے، چمکتے ہوئے کالے بالوں
پہ ایسی سپیدی اُمنڈ آئے گی کچھ تدارک نہیں جس کا کوئی
کوئی راستہ اور ڈھونڈو
کہ اس پیر فرتوت کی تیز نظروں سے بچ کر
نکل جائیں اور اس کی زد میں نہ آئیں کبھی ہم

اِدھر سے نہ جاؤ
اِدھر میں نے اک شخص کو جاتے دیکھا ہے اکثر
جوانوں کو جو راہ میں روک لیتا ہے، ان سے
وہیں باتیں کرتا ہے مِل کر
جو سقراط کرتا تھا یونان کے من چلوں سے
یقیناً اسے ایک دن زہر پینا پڑے گا!

اِدھر سے نہ جاؤ
اِدھر روشنی ہے
کہیں آؤ چھپ جائیں جا کر تمام آفتوں سے
مجھے ایک تہہ خانہ معلوم ہے خوش نما سا
جو شاہانِ دہلی نے بنوایا تھا اس غرض سے
کہ ابدالیوں، نادری فوج کی دسترس سے
بچیں اور بیٹھے رہیں سارے ہنگاموں کی زد سے ہٹ کر
یہ دراصل میراث ہے آپ کی، میری، سب کی
سلاطینِ دہلی سے پہلے کسی اور نے اس کی بنیاد رکھی تھی لیکن
وہ اب قبل ِتاریخ کی بات ہے، کون جانے

اِدھر سے نہ جاؤ
اِدھر شاہ نادؔر نہیں آج کوئی بھی لیکن
وہی قتلِ عام آج بھی ہو رہا ہے
یہ میراث ہے آپ کی، میری، سب کی
یہ سوغات بیرونی حاکم ہمیں دے گئے ہیں
چلو سامنے کے اندھیرے میں گھس کر
اتر جائیں تہہ خانے کی خامشی میں
یہ سب کھڑکیاں بند کر دیں
کوئی چیخنے بین کرنے کی آواز ہم تک نہ آئے
کوئی خون کی چھینٹ دامن پہ آکر نہ بیٹھے

کبھی تم نے گانجا پیا ہے؟
کوئی بھنگ کا شوق، کوئی جڑی بوٹی کھائی
نہ کوکین افیون کچھ بھی!
کبھی کوئی نشہ نہیں تم نے چکھا
نہ اغلام امرد پرستی سے رشتہ رہا ہے
کوئی تجربہ بھی نہیں زندگی کا؟

فسادات دیکھے تھے تقسیم کے وقت تم نے
ہوا میں اُچھلتے ہوئے ڈنٹھلوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستاں بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھی تھیں کیا بین کرتے؟
نہیں یہ تو نشہ نہیں، تجربہ بھی نہیں ایسا کوئی
یہ اک سانحہ ہے
فراموشگاری کا احسان مانو
یہ سب کل کی باتیں ہیں، بوسیدہ باتیں
جنھیں بھول جانا ہے بہتر
فراموشگاری بھی
اک نعمتِ بے بہا ہے

اِدھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا

نیا کوئی خطرہ، نیا مسئلہ کوئی جس کو
نہ سوچا نہ سمجھا نہ احساس ہے جس کا اب تک

کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہِ فرار ایسی ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنّم کو جنّت سمجھ لیں!

۵ نومبر ۱۹۷۲

مُناجات

آشفتہ خاطری مری مٹی میں ہے مِلی
تم یونہی مجھ کو دیکھ کے آزردہ ہو گئے
ہر لمحہ قبر ہے گئے لمحے کی، ہر نفس
پہلے نفس کی گور ہے، افسردہ ہو گئے
کارِ جہاں ڈھکا ہے مناظر کے حُسن سے
افسونِ جدلیات سے غم مُردہ ہو گئے
یوں سمجھو ساز باز ہے اک موت سے حیات
شر قوّتِ نمو کا محرّک ہے، سادگی
اک ماندگی کی شکل ہے، یونہی چلے چلیں
بے پایاں ممکنات کا یہ بحرِ بے کنار
ہم جس میں تیرتے ہیں، خُدائے عظیم ہے
مظہر ہے یا خُدا کا، چلو سر بہ سجدہ ہوں

اے ربِّ لا یزال کوئی راہِ مستقیم
مجھ کو نہ بخش دینا، یونہی بے قرار رکھ
لا کے محیط میرا مرض آگہی نہیں
اک تشنگی ہے، میرا مرض لاعلاج کر
پھیلا دے اور آگ زمیں پر مرے لیے

تو دہر کا مزاج ہے میرا مزاج کر
منعم، غنیم، قافلہ سالار، اشتہاء
کچھ اِس طرح کے اور بھی الفاظ دے مجھے
مفلوج کر کے میرے قویٰ، میرے ولولے
پھر حوصلہ دے، ہمّتِ پرواز دے مجھے
آبِ حیات زہر بنا دے مرے لیے
یہ زہر اس کے بعد رگوں میں اُتار دے
دِن، اس کی برکتیں، جسے جی چاہے بخش دے
دائم تڑپ مجھے، خلشِ انتظار دے
۱۵ مارچ ۱۹۷۳

مَیں -- تمھاری ایک تخلیق

میں پیمبر نہیں
دیوتا بھی نہیں
دوسروں کے لیے جان دیتے ہیں وہ
سولی پاتے ہیں وہ
دِل دہی، چارہ سازی کے تاوان میں
نامُرادی کی راہوں سے جاتے ہیں وہ
مَیں تو پروردہ ہوں ایسی تہذیب کا
جس میں کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ
شر پسندوں کی آماجگہ
امن کی قمریاں جس میں کرتب دکھانے میں مصروف ہیں
مَیں ربڑ کا بنا ایسا بوا ہوں جو
دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے سب
پیٹ میں جس کے سب زہر ہی زہر ہے
پیٹ میرا کبھی گر دباؤ گے تم
جس قدر زہر ہے
سب الٹ دوں گا تم سب کے چہروں پہ مَیں

۱۵ اپریل ۱۹۷۳

جلا وطن

یہ ہم اپنے کاندھوں پہ خود اپنی لاشیں اُٹھائے کہاں جا رہے ہیں
کوئی شہرِ نو، کوئی موعودہ جنّت بنائی گئی ہے کہیں پر کہ ہم کو
نکالا مِلا ہے، یونہی صرف معمول ہیں، ہم پہ تاریخ نشتر چلاتی ہے اپنا
نہاں خانۂ دوش و امروز میں قید کر کے، گلا گھونٹ کر مار دے گی
نہ فریاد جس کی، نہ داد و ستائش، کوئی محتسب ہے، نہ منصف ہے کوئی
مکافات، کفّارہ، سود و زیاں، بانجھ الفاظ ہیں سب سراسر
ہر اک بیتا لمحہ ہماری نئی قبر ہے جس میں ہم سو گئے اپنا ماضی گلے سے لگائے
مجاور ہیں ہم، اپنے ہی نوحہ خواں ہیں، خود اپنی ہی قبروں پہ بیٹھے ہیں مشعل جلائے
گدائی کا کاسہ لیے ہاتھ میں، اپنے ہی اشک چُنتے ہیں اور اس میں بھرتے ہیں ایسے
کہ جیسے یہی اپنا مقسوم تھا، زندگی کا یہی کہنہ دستور ہے اور رہے گا!

۱۰ دسمبر ۱۹۷۳

گُریز

رابطہ جسم و جاں میں کتنا ہے
رشتہ اس دِل ستاں سے کیسا ہے
کیا ہے وہ، زہر ہے کہ آبِ حیات
بارہا جس کو پی کے دیکھا ہے
کیوں نہیں لکھتے ان حقائق پر
جن کا دامن لہو سے بھیگا ہے
یہ ہیں اور ایسی ڈھیر سی باتیں
جن سے گزرے، چھوا ہے، چکھا ہے
ہم فراموش کرتے رہتے ہیں
آپ ہی خود سے ڈرتے رہتے ہیں

۲۰ دسمبر ۱۹۷۳

متاعِ رائگاں

یہ دردِ زندگی کس کی امانت ہے کسے دے دوں
کوئی وارث نہیں اس کا، متاعِ رائگاں ہے یہ
مسیحا اب نہ آئیں گے، یہی نشتر رگِ جاں میں
خلش بنتا رہے گا، میری سانسوں میں نہاں ہے یہ
خُدایا ہم سے پہلے لوگ بھی جو اس زمیں پر تھے
یونہی پامال ہوتے تھے، جو اس کے بعد آئیں گے
امیدِ صبح کے خنجر سے زخمی ہو کے جائیں گے؟
(کہاں جا کر رُکے گا قافلہ ان سوگواروں کا)
یہ پھر بھی تیرے بندے ہیں، تری ہی حمد گائیں گے
انھیں آنکھیں تو دے دی ہیں، بصارت بھی انھیں دیدے
تجھے سب ڈھونڈتے ہیں اس طرح اندھے ہیں سب جیسے
اسی کورے ورق پر کچھ عبارت بھی انھیں دیدے
کھڑا ہے منہ کیے مشرق کی جانب، کوئی مغرب کی
(مری تصویر میں ان چیختے رنگوں کی ایسی کیا ضرورت تھی)
خُدایا بخش دے ان بے گناہوں کے گناہوں کو
یہ معنی ڈھونڈتے ہیں، کشمکش میں رات اور دِن کی
حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں سال اور سِن کی
یہ سب مجبور ہیں، ان پر درِ توبہ کھلا رکھنا

یہ دُنیا خوف اور لالچ پہ جس کی نیو رکھی ہے
اسی مٹی سے پھوٹے ہیں، اسی دھرتی کے پالے ہیں
اُجالا بھی یہی ہیں اس زمیں کا اور اندھیرا بھی
یہی شہ کار ہیں تیرا، یہی پاؤں کے چھالے ہیں
(یہ سب کے سب لباسِ فاخرہ میں میلی بھیڑیں ہیں)
الٰہ العالمیں اِن کی خطا سے دَر گزر کرنا
بہت معذور ہیں یہ خود نگر اپنی جبلّت سے
مقدّر اِن کا ہے شام و سحر کو روز سَر کرنا
مساعی اِن کی سیم و زر کے ڈھیروں میں بدل دینا
ترے پاس آئیں، موتی کے محل محنت کا پھل دینا

۲۵ جون ۱۹۷۴

تادیب

دوسروں کو سدھارنے مت جاؤ
اپنی اصلاح پر نظر رکھو
لوگ کیا کر رہے ہیں، چھوڑو انھیں
اپنے افعال کی خبر رکھو
سرزنش اپنی خوب کرتے رہو
ایک شہدا جہاں میں کم ہوگا!

۲۸ جون ۱۹۷۴

نیا آہنگ

کراماً کاتبین اعمال نامہ لکھ کے لے جائیں
دکھائیں خالق کون و مکاں کو اور سمجھائیں
معانی اور لفظوں میں وہ رشتہ اب نہیں باقی
لغت الفاظ کا اک ڈھیر ہے، لفظوں پہ مت جانا
نیا آہنگ ہوتا ہے مرتب لفظ و معنی کا
مرے حق میں ابھی کچھ فیصلہ صادر نہ فرمانا
میں جس دن آؤں گا تازہ لغت ہمراہ لاؤں گا

۲۲ جولائی ۱۹۷۴ء

مرگِ نغمات

ہم اسی شہر کی دیواروں سے باتیں کر کے
جیتے رہتے تھے، ہر اک خشت مہک اُٹھتی تھی
جب دریچے سے کوئی حرفِ تسلّی، کوئی بات
یوں اُترتی تھی وحی آتی ہو جیسے، آواز
اک کھنکتا ہوا چشمہ تھا، بہت رنگوں کا!
اور ترسی ہوئی دیدار کی پیاسی آنکھیں
اُٹھ کے جھک جاتی تھیں اظہارِ تشکّر میں، فضا
جیسے ہو جاتی تھی اک ثانیہ کو صرفِ سجود!
آج کیا بات ہے، سناٹا ہے کیوں چاروں طرف؟
کیوں مُجھے بُوئے کفن آتی ہے دیواروں سے؟

۳۰ جولائی ۱۹۷۴

ایک کیفیت

وحی اُترتی تھی جیسے پیمبروں کے لیے
ترا خیال مرے ذہن پر اُترتا ہے
ہر ایک سمت اُجالا سا پھیل جاتا ہے
خود اپنے آپ پہ بھی یہ گماں گزرتا ہے
زمین ہوں میں، سمندر کی تہہ سے اُبھرا ہوں!

۱۲ اگست ۱۹۷۴

لطیفہ

یہ سوچتے ہی رہے ہم کہ زندگی کیا ہے
کوئی صحیفہ ہے پروردگار کا لکھا
کوئی معمہ ہے، یا حرفِ الفت و راحت
جمال گاہ، کہ مقتل ہے آرزوؤں کا
کوئی حبیبہ ہے، قحبہ ہے، کون ہے، کیا ہے
کوئی لطیفہ ہے، سُننے کا یا سُنانے کا
جواب پانے کی باری جب اپنی آئے گی
تو کیا تماشا ہے، اُس وقت ہم نہ ہوں گے یہاں!

کالے سفید پروں والا پرندہ
اور میری ایک شام

جب دن ڈھل جاتا ہے، سورج دھرتی کی اوٹ میں ہو جاتا ہے
اور بھڑوں کے چھتے جیسی بھِن بھِن
بازاروں کی گرمی، افراتفری
موٹر، بس، برقی ریلوں کا ہنگامہ تھم جاتا ہے
چائے خانوں ناچ گھروں سے کم سن لڑکے
اپنے ہم سن معشوقوں کو
جن کی جنسی خواہش وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے
لے کر جا چکتے ہیں
بڑھتی پھیلتی، اونچی ہمالہ جیسی تعمیروں پر خاموشی چھا جاتی ہے
تھیٹر تفریح گاہوں میں تالے پڑ جاتے ہیں
اور بظاہر دنیا سو جاتی ہے
میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچا کرتا ہوں
کتوں کی دم ٹیڑھی کیوں ہوتی ہے
یہ چتکبری دنیا جس کا کوئی بھی کردار نہیں ہے
کوئی فلسفہ، کوئی پائندہ اقدار نہیں، معیار نہیں ہے
اس پر اہلِ دانش، وِدوان، فلسفی

موٹی موٹی ادق کتابیں کیوں لکھا کرتے ہیں؟
فرقت کی ماں نے شوہر کے مرنے پر کتنا کہرام مچایا تھا
لیکن عدت کے دن پورے ہونے سے اک ہفتہ پہلے
نیلم کے ماموں کے ساتھ بدایوں جا پہنچی تھی
بی بی کی صحنک، کونڈے، فاتحہ خوانی
جنگ صفین، جمل اور بدر کے قصوں
سیرت نبوی، ترک دنیا اور مولوی صاحب کے حلوے مانڈے میں کیا رشتہ ہے؟

دن تو اڑ جاتے ہیں
یہ سب کالے پر والے بگلے ہیں
جو ہنستے کھیلتے لمحوں کو
اپنے پنکھوں میں موند کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
راحت جیسے خواب ہے ایسے انسانوں کا
جن کی اُمیدوں کے دامن میں پیوند لگے ہیں
جامہ ایک طرف سیتے ہیں دوسری جانب پھٹ جاتا ہے
یہ دنیا لمحہ لمحہ جیتی ہے
مریم اب کپڑے سیتی ہے
آنکھوں کی بینائی ساتھ نہیں دیتی اب
اور غضنفر
جو رومال میں لڈو باندھ کے اس کے گھر میں پھینکا کرتا تھا
اور اس کی آنکھوں کی توصیف میں غزلیں لکھوا کر لایا کرتا تھا

اُس نے اور کہیں شادی کر لی ہے
اب اپنی لکڑی کی ٹال پہ بیٹھا
اپنی کج رائی اور جوانی کے قصّے دہرایا کرتا ہے
ٹال سے اٹھ کر جب گھر میں آتا ہے
بیٹی پر قدغن رکھتا ہے
نئے زمانے کی اولاد اب ویسی نہیں رہ گئی
بدکاری بڑھتی جاتی ہے
جو دن بیت گئے کتنے اچھّے تھے!

برگد کے نیچے بیٹھو یا سولی چڑھ جاؤ
بھینسے لڑنے سے باز نہیں آئیں گے
مَوت سے ہم نے ایک تعاوّن کر رکھا ہے
سڑکوں پر سے ہر لمحہ اک میت جاتی ہے
پس منظر میں کیا ہوتا ہے، نظر کہاں جاتی ہے
سامنے جو کچھ ہے رنگوں آوازوں چہروں کا میلا ہے!

گرگل اُڑ کر وہ پلکھن پر جا بیٹھی
پیپل میں توتے نے بچّے دے رکھّے ہیں
گلدم جو پکڑی تھی کل بے چاری مر گئی
نجمہ کے بیلے میں کتنی کلیاں آئیں ہیں
پھولوں کی خوشبو سے کیا کیا یاد آتا ہے

یہ جب کا قصہ ہے سڑکوں پر نئی نئی بجلی آئی تھی
اور مجھے سینے میں دِل ہونے کا احساس ہوا تھا
عید کے دن ہم نے لٹھے کی شلواریں سلوائی تھیں
اور سویّوں کا زردہ ہمسائے میں بھجوایا تھا
سب نیچے بیٹھک میں بیٹھے تھے
میں اُوپر کے کمرے میں بیٹھا
کھڑکی سے زینب کے گھر میں پھولوں کے گچھے پھینک رہا تھا
کل زینب کا گھر نیلام ہو رہا ہے
سرکاری تحویل میں تھا اک مدّت سے!

شاید پت جھڑ کا موسم آ پہنچا
پتوں کے گرنے کی آواز مسلسل آتی ہے
چیچک کا ٹیکہ بیماری کو روکے رکھتا ہے
ضبطِ تولید، اسقاط وغیرہ
انسانی آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے
بندر نے جب سے دو ٹانگوں پر چلنا سیکھا
اس کے ذہن نے حرکت میں آنا سیکھا ہے
پتوں کے گرنے کی آواز مسلسل آتی ہے
سڑکوں پر روز نئے چہرے ملتے ہیں
موت سے ہم نے ایک تعاون کر رکھا ہے
پس منظر میں نظر کہاں جاتی ہے

پھولوں کی خوشبو سے کیا کیا یاد آتا ہے
چوک میں جس دن پھول پڑے سڑتے تھے
خونی دروازے پر شہزادوں کی پھانسی کا اعلان ہوا تھا
یہ دنیا لمحہ لمحہ جیتی ہے
دلّی کی گلیاں ویسی ہی آباد شاد ہیں سب
دن تو کالے پر والے بگلے ہیں
جو سب لمحوں کو
اپنے پنکھوں میں موند کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
چاروں جانب رنگ رنگ کے جھنڈے اُڑتے ہیں
سب کی جیبوں میں انسانوں کے دُکھ درد کا درماں
خوشیوں کا نسخہ بندھا پڑا ہے
لیکن ایسا کیوں ہے
جب نسخہ کھلتا ہے
۱۸۷۵ جاتا ہے
۱۹۴۷ آجاتا ہے

۸ نومبر ۱۹۷۵

فصل ۸

سر و ساماں، اشاعت ۱۹۸۳

(ہندی رسم الخط میں اطہر فاروقی کی ترتیب کردہ 'سر و ساماں' سارانش پبلیکیشنز، دہلی نے ۱۹۹۶ میں چھاپی۔ اسی نام سے اردو کتاب کا چربہ، بغیر اجازت، المسلم پبلشرز، کراچی نے ۱۹۹۲ میں چھاپا۔ 'سر و ساماں' میں ۱۹۸۳ تک کی سب نظمیں شامل ہیں، مگر اس فصل میں صرف وہ نظمیں درج ہیں جو 'نیا آہنگ' کے بعد لکھی گئیں)

سُلطانہ کے نام

جو زندگی کے تمام کرب، صعوبتوں اور مشکلوں میں میری برابر کی شریک ہے

پیش لفظ: اخترالایمان

مطبوعہ: رخشندہ کتاب گھر، بمبئ

ترقی کی رفتار

سحر گاہ اٹھتا ہوں جب رات کا بوجھ شانوں پہ لے کر
تو جی چاہتا ہے کہ گزری ہوئی کل سے رشتہ نہ ہوتا
فراموشگاری تعلق کی سب ڈوریاں کاٹ دیتی
گئی رات جب ٹوٹ کر اپنے بستر میں سوتا
پُرانے قفس سے نئے کالبد میں چلا جاتا اُڑ کر
ملوّث فضا شہر کی چھوڑ جاتا بہت پیچھے اپنے
نیا دن اُبھرتا کسی گیت گاتے پرندے کی آواز کے ساتھ مِل کر
نکل جاتا پگڈنڈیوں پر جہاں میرے نقشِ قدم اب بھی ہوں گے
کُھلے کچے رستے جو خوشبو سے جنگل کی مہکے ہوئے ہوں
جہاں ایک سبزے کی چادر ہو پھیلی ہوئی دوُر حدِ نظر تک
ہر اک سمت خود رو گلوں پر سبک تتلیاں ناچتی ہوں
کنول جوہڑوں میں
خزاں دیدہ اشجار جن میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہوں
سرِ شام بیری کے پیڑوں میں چڑیوں کا جھالا
وہی تیتروں کی صدا ، کال کلچی کی آواز ، شاما کا نغما
ہر اک راہ کے موڑ پر شور غوغائیوں کا
ہرے، ٹھنڈے، شیشم کے پتوں سے چھنتی ہوئی ہوک سی فاختہ کی
گھنے کانس کے پھولے جنگل میں اڑتی بیوں کی قطاریں
وہیں کیکروں میں نئے گھونسلوں کی جگہ ڈھونڈتیں

سُبکسار موجِ ہوا زعفراں کی مہک بانٹتی
افق سے افق تک کوئی ایسا منظر نہ ہو
جو کھٹکتا ہو دِل میں!
مگر کانس کا پھولا جنگل، بیوں کی قطاریں
بھرے، لہلہاتے ہوئے کھیت، اُٹھتی بہاریں
بٹیروں کے دَل، چوکڑی بھرتی ہرنوں کی ڈاریں
کہاں ہیں یہ منظر؟
یہاں تو مجھے ہر طرف کارخانے
دھوئیں کے بگولے نظر آ رہے ہیں

یکم اگست ۱۹۷۷

توکّل

آسمانوں سے مدد آئیگی، امید رکھو
فتح و نصرت کے لیے صبر کی تسبیح پڑھو
اپنے سب کام، ہر اک بات خُدا پر چھوڑو
سیڑھیاں درد کی بس اُترو چڑھو، اُترو چڑھو
عزم فالج زدہ ہیں گر نہ ہوں طالع بیدار
زیست ہے بند گلی چاہے جدھر، جیسے بڑھو
ایسا کچھ ہوتا ہے محسوس بہت بار مگر
ذہن سرکش ہے، بھلا ہار کہاں مانتا ہے

۱۳ دسمبر ۱۹۷۷

ایک جامِد تصویر

یہ درس گاہ کوئی ہے جہاں کھڑی ہو تم
اندھیرے اور اُجالے کے درمیاں، تنہا
تمھارے ذہن میں کیا ہے، مجھے نہیں معلوم
مگر مجھے ہے فقط ایک ہی گماں، تنہا
جو راہ روکے کھڑی ہو تو ہے ملال تمھیں
اس ایک بات کا پہنچا ہے جس سے رنج مجھے
مرے خلوص کا احساس ہو گیا ہے تمھیں
اور اب تمھاری یہی ایک صرف کوشش ہے
کہ اپنی شیریں زبانی سے اندمال کرو
وہ زخم بھر دو لگا ہوگا جو مجھے شاید!
جو دی تھی تم نے اذیت، وہ مَیں نے لوٹا دی
تمھارے لب نہ کُھلے تھے کہ مَیں پلٹ آیا
قدم تو بڑھتے رہے شرق، غرب، شمال، جنوب
کہاں کہاں لیے پھرتے رہے مرے حالات
مسافتوں کی گراں باریاں لیے سر پر
تمام عُمر چلا، دن کوئی تھا میری نہ رات
مگر یہ مَیں نہیں، ہمزاد تھا مرا شاید
کہ مَیں تو، راہ جہاں میری تم نے روکی تھی
وہیں کھڑا ہوں، گنہ گار کی طرح، چُپ چاپ!

۲۳ دسمبر ۱۹۷۷

تضاد

میں کھڑکی کے نیچے کھڑا ہوا تھا
تم شاید کمرے میں سوئی ہوئی تھیں
چاند فضا میں دھیرے دھیرے تیر رہا تھا
دن کی چیخیں سناٹے میں کھوئی ہوئی تھیں
ہوٹل کے اک کمرے سے کل جب اک لڑکا
اپنی محبوبہ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نکلا
مجھ کو وہ پھیکا سا منظر یاد آیا

۲۹ اکتوبر ۱۹۷۸

حمّام باد گرد

ہمارے درد کی کلیاں تو غنچے بن گئیں بادِ بہاری نے
انھیں ایسا نکھارا ہے کہ ہر شاخِ تمنا سے
مہک آتی ہے بوئے مشک و عود و خوں کے جلنے کی
ہماری کوششیں سب بار آور ہوگئیں الحمدللہ اب وہ دن آیا
صلیبوں، زہر کے پیالوں، قلم زد سر ہوئے جو ان کو حرزِ جاں بنائے ہم
نئی سمتوں کی جانب جادہ پیما ہیں
ہماری مضطرب روحیں
بدلتے موسموں کا جامہ پہنے شدّتِ احساس کے دوزخ میں رقصاں ہیں

بہت دن سے کوئی جشنِ بہاراں ہی نہیں ہم نے منایا کیا قیامت ہے
ضروری تو نہیں سب گورکن شامل ہوں اس جشنِ بہاراں میں
وہ دانا سب، طنابیں ہیں زمیں کی جن کے ہاتھوں میں
انھیں فرصت کہاں ہے گول یا چوکور دفتر سے نکلنے کی
اگر میلادِ آدم کی صحیح تاریخ کا اب تک تعیّن ہوگیا ہوتا
تو اس کی جائے پیدائش بھی اب تک مِل گئی ہوتی
بہانہ جشنِ گُل پوشی منانے کا نکل آتا
اور ایسا شان دار اک مقبرہ بنواتے دنیا دیکھتی برسوں
مجاور تو بہت ہیں نام اخباروں میں چھپتے ہیں
جو حقِ آدمیت کے لیے سب سے زیادہ جوش دکھلاتا

اسی کو سونپ دیتے مقبرہ کی کار فرمائی
مگر میلادِ آدم کی صحیح تاریخ اب تک مِل نہیں پائی!

ہمارے عجز کی تاریخ کا پہلا ورق جس نے لکھا ہوگا
وہ پتھر ہوگیا ہوگا
اور اس کے بعد سے اب تک کوئی حاتم نہیں آیا
جو اپنے تیر سے حمام کے پنجرے کے طوطے کی
چمکتی آنکھ میں اک تیر کو پیوست کر دیتا
جو پتھر بن گئے ہیں ان کو پھر سے زندگی دیتا

کبھی تم نے مسیحا کے نئے نائب کو دیکھا ہے؟
وہ جس کے ڈھیر سارے ہاتھ ہیں ان اپنے ہاتھوں سے
کسی کو ایسا دستاویز دیتا ہے جلی حرفوں میں جس پر 'امن' لکھا ہے
اسی لمحے کسی کو دوسرے ہاتھوں سے سامانِ جدل کی پیش کش بھی ہے!
ہم آخر سر بسجدہ کیوں نہیں ہوتے؟
ہمارے عجز کی تاریخ تو لکھی گئی، جس نے
لکھی ہوگی بہت پیشانیوں کو واژگوں پا کر
یہ فتویٰ دے دیا ہوگا
خدائے عصر کو سجدہ کرو، سجدہ روا ہے یہ!

تو یوں ہے صاحبو جو صور پھونکا جائے گا قبروں سے نکلیں گے
وہ عاشق بھی جنھوں نے اس زمیں کو جنت الفردوس کی صورت میں دیکھا تھا

پریشاں حال، سینہ چاک، چہرے درد آلودہ!
وہ دانا بھی طنابیں ہیں زمیں کی جن کے ہاتھوں میں
سب اپنی سرگرانی کو اٹھائے اپنے کاندھوں پر
وہ آقا بھی بغل میں جن کے ننگی عورتیں ہوں گی
وہ خادم بھی نگاہیں جن کی دھرتی میں گڑی ہوں گی
مگر ہاتھوں میں جامِ ارغوانی اور شرابِ ناب کی کشتی سجی ہو گی
پیمبر اور مشائخ بھی
صحیفے اور کتابیں اپنی تھامے اپنے ہاتھوں میں
خدا کے سامنے جب پیش ہوں گے، ہنس کے ان سب سے کہے گا وہ
مجھے معلوم تھا تم جو کرو گے، میں فرشتوں سے بھی کہتا تھا
"میں وہ سب جانتا ہوں تم نہیں جس سے ابھی واقف
چلو اک بار پھر دنیا میں جاؤ ایک موقع اور دیتا ہوں
مگر اس بار کچھ تھوڑا سا قدغن ہے
غلط سمجھے ہو، ضبطِ نفس کو تم سے نہیں کہتا
اشارہ ضبطِ تولید اور کم آبادی کی جانب ہے

۲۹ جنوری ۱۹۷۹

دِن کا سفر

اگر چاہتے ہو بھرم آدمی کا اسی طرح قائم رہے جیسے تم چاہتے ہو
اگر چاہتے ہو کہ دن عافیت سے گزر جائے سارا
یہ دُنیا تمھیں ایسی جنّت نظر آئے جس کا بدل ہی نہیں ہے
تگ و دَو شب و روز کی، ساعتیں سوانگ بھرتی ہوئیں، ہر نظارا
خُدائے وجود و عدم، نیک و بد کی کرامات کا ایسا مظہر ہو، محسوس ہر شے
کہ جی چاہے اس رُت بدلتی ہوئی رنگ بھُومی میں آئیں دوبارہ
سویرے سویرے نہ اخبار پڑھنا!

۱۷ فروری ۱۹۷۹

گونگی عورت

کیوں حیرت سے تکتی ہے ایک اک چہرے کو
کیا تجھ کو شکوہ ہے تیری گویائی کی طاقت
چھین کے قدرت نے بے انصافی کی ہے؟
کیا تجھ کو احساس ہے تیرے پاس اگر گفتار کی نعمت ہوتی
تو اس چاروں جانب پھیلی ہتھیاروں کی دُنیا
سینے دہلا دینے والے طیاروں کی انساں کش آوازیں
آوازیں جن میں انساں کی روح شبانہ روز دبی جاتی ہے
محشر خیز آوازیں کل پُرزوں کی جن سے نفسی نفسی کا عالم پیدا ہو کر
دن پر دن عفریت کی صورت بڑھتا میں جاتا ہے
اِن آوازوں کی ہیبت ناکی پر واویلا کرتی
تُو آواز اٹھاتی اس فاشی اور تعصّب پھیلانے والے عنصر کو بڑھتا پا کر
جو حُبّ الوطنی کے نام پہ انساں کُش ہوتا جاتا ہے
تو ان رجحانات کی خوب مذمّت کرتی
ان سے لڑتی جو اس دنیا کو پیچھے لے جانے میں کوشاں ہیں
'مذہب اور تہذیب'
'ثقافت' اور 'ترقی' کہہ کر رجعت پرور ہو جاتے ہیں
لے میں تجھ کو اپنی گویائی دیتا ہوں!
یہ میرے کام نہیں آئی کچھ

میں ایسا بزدل ہوں جو ہر بے انصافی کو چپکے چپکے سہتا ہے
جس نے 'مقتل' اور 'قاتل' دونوں دیکھے ہیں
لیکن دانائی کہہ کر
اپنی گویائی کو گونگا کر رکھا ہے!

۴ مارچ ۱۹۷۹

پھر غزل خوانی کرو

مدّتیں گزریں، زمانہ ہو گیا
یار کو مہماں کرو
راحتِ جاں کا کوئی ساماں کرو
رسمِ دلداری نبھانے کا یہی موسم تو ہے
جب خزاں دیدہ بہاریں پھر جواں ہونے کی خواہش میں پلٹ کر آئیں گی
جب پُرانے گھاؤ سب
مندمل ہو جائیں گے
جیسے بے معنی شرارت تھی ہوا جو کچھ نہ تھا
ہم سے گر پوچھو تو سچ کچھ بھی نہیں
اس کی آنکھوں کے تبسّم کے سوا
خواب گر، عیسیٰ نفس کے اک تکلّم کے سوا
جسم کے بے ساختہ دھیمے ترنّم کے سوا
آبلوں پر اپنا نشتر جب رکھے جرّاحِ وقت
مضمحل اعصاب میں بجلی سی دوڑانے لگے
تب کہو جینے کا امکاں ہو گیا
عظمتِ انساں یہی تو ہے چھپا لے زخم سب
خون سے تر ہو جو دامن، گُل بدامانی کہے
آرزو کی جلوہ سامانی کہے
گوہر افشانی کہے دشنام کو

ہر خلش کو مایۂ جانی کہے
خواہشِ راحت مرض ہے، اس کا درماں چاہیے
خود کو بہلاؤ کہ بس اگلے برس اگلے برس
رسمِ غم خواری نبھانے کا یہی موسم تو ہے
دِل کو سمجھاؤ کہ بس اگلے برس اگلے برس
مکتبِ غم اس لیے ہی تو کھُلا ہے، سیکھ لیں
کس نہاں خانے میں رکھیں وہ ہزیمت خوردگی
جس کو لا فانی کہیں
روح فرسا اب کوئی منظر نہیں
عظمتِ انساں یہی تو ہے دہانِ زخم کو
گل بنا کر پیش کر دے ہر نمائش گاہ میں
کوئی موسم ہو، غزل خوانی ہمارا شیوۂ اجداد ہے
پھر غزل خوانی کرو
ہے تاسّف چارہ گر کو اب ہمارے حال پر
اب اسے بھی چارہ سازی آ گئی
دِل نوازی آ گئی
وہ علی گڑھ ہو کہ لندن، شہر سب یکساں ہیں آج
بالا دستو اپنے بے پایاں کرم کی پھر فراوانی کرو
ہے پھر اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت بہت
دو ستم کو پھر ہوا، پھر غم کی ارزانی کرو
پھر غزل خوانی کرو
مدتیں گزریں، زمانہ ہو گیا

۶ دسمبر ۱۹۷۹

ڈاسنہ سٹیشن کا مسافر

"کون سا سٹیشن ہے؟،،
ڈاسنہ ہے صاحب جی
آپ کو اترنا ہے؟،،
"جی نہیں، نہیں"، لیکن
ڈاسنہ تو تھا ہی وہ
میرے ساتھ قیصؔر تھی
یہ بڑی بڑی آنکھیں
اک تلاش میں کھوئی
رات بھر نہیں سوئی
جب میں اس کو پہنچانے
اس اجاڑ بستی میں
ساتھ لے کے آیا تھا
میں نے ان سے پھر پوچھا
آپ مستقل شاید
ڈاسنہ میں رہتے ہیں؟
"جی یہاں پہ کچھ میری
سُوت کی دکانیں ہیں
کچھ طعام خانے ہیں"
میں سُنا کیا بیٹھا

بولتا رہا وہ شخص
"کچھ زمین داری ہے
میرے باپ دادا نے
کچھ مکان چھوڑے تھے
ان کو بیچ کر میں نے
کاروبار کھولا ہے
اس حقیر بستی میں
کون آ کے رہتا تھا
لیکن اب یہی بستی
بمبئی ہے دلّی ہے
قیمتیں زمینوں کی
اتنی بڑھ گئی صاحب
جیسے خواب کی باتیں
اک زمین ہی کیا ہے
کھانے پینے کی چیزیں
عام جینے کی چیزیں
بھاؤ دس گنے ہیں اب"
بولتا رہا وہ شخص
"اس قدر گرانی ہے
آگ لگ گئی جیسے
آسمان حد ہے بس"
میں نے چونک کر پوچھا

آسماں محل تھا اک
سیّدوں کی بستی میں
"آسمان ہی نہیں صاحب
اب محل کہاں ہوگا؟"
ہنس پڑا یہ کہہ کر وہ
میرے ذہن میں اُس کی
بات پے بہ پے گونجی
"اب محل کہاں ہوگا"
اس دیار میں شاید
قیصؔر اب نہیں رہتی
وہ بڑی بڑی آنکھیں
اب نہ دیکھ پاؤں گا
ملک کا یہ بٹوارا
لے گیا کہاں اس کو
دیوڑھی کا سنّاٹا
اور ہماری سرگوشی
"مجھ سے کتنے چھوٹے ہو"
میں نے کچھ کہا تھا پھر
اس نے کچھ کہا تھا پھر
ہے رقم کہاں وہ سب
درد کی گراں جانی
میری شعلہ افشانی

اس کی جلوہ سامانی
ہے رقم کہاں وہ اب
کربِ زیست سب میرا
گفتگو کا ڈھب میرا
اس کا ہاتھ ہاتھوں میں
لے کے جب میں کہتا تھا
اب چھڑاؤ تو جانوں
رسمِ بے وفائی کو
آج معتبر مانوں
اس کو لے کے باہوں میں
جھک کے اس کے چہرے پہ
بھینچ کر کہا تھا یہ
بولو کیسے نکلو گی
میری دسترس سے تم
میرے اس قفس سے تم

بھورے بادلوں کا دَل
دُور اُڑتا جاتا ہے
پیڑ پر کہیں بیٹھا
اک پرند گاتا ہے
"چل چل" اک گلہری کی
کان میں کھنکتی ہے

ریل چلنے لگتی ہے
راہ کے درختوں کی
چھاؤں ڈھلنے لگتی ہے
"مجھ سے کتنے چھوٹے ہو"
اور مری گراں گوشی
دیوڑھی کا سناٹا
اور ہماری سرگوشی
ہے رقم کہاں وہ سب؟

دُور اس پرندے نے
اپنا گیت دہرایا
"آج ہم نے اپنا دِل
خوں کیا ہوا دیکھا
گم کیا ہوا پایا"

۱۶ دسمبر ۱۹۷۹

جیونی -- ایک طویل نظم (ناتمام)

(ا) ورُود

اس جہانِ گل و بُلبل و زاغ میں
اُتری ہند کے چھوٹے سے گاؤں میں
ایک کاتک کی ٹھٹھری ہوئی رات میں
شب کے پہلے پہر، تاروں کی چھاؤں میں
پھونس کے ایک چھپّر میں پیدا ہوا
حسبِ دستور، کچھ دیر رویا کیا
اور پھر جیسے جی کو قرار آگیا
جیسے دارالمحن سازگار آگیا

(۲) مہایُدھ

میں نے اتنے برس چیونٹی کی طرح
رینگ کر زندگی کے گزارے ہیں یوں
جیسے ہر گام پر ایک دیوار تھی
ایک گھمسان کا رن تھا، پیکار تھی
میں نہتا کھڑا تھا، جہاں کوئی بھی
میرا مونس، نہ جرگہ کا انسان تھا
وار اتنے ہوئے، جسم ہلکان تھا
اس مہا یدھ میں سب ہی جاتا رہا
ایک شعلہ تھا اندر جو باقی بچا
اب وہ سامنت ہوں میں جو آوارہ ہے
مارکنڈے ہوں، میں جو وجود و عدم
کے خلا میں بھٹکتا ہے اک عمر سے
جو زمیں کی طرح کب سے گردش میں ہے

(۳) تلاش کی پہلی اُڑان

رزق کی جستجو لے گئی سُو بہ سُو
جسم کی آرزو لے گئی سُو بہ سُو
اور جب خوانِ نعمت سجایا گیا
ایک گل پیرہن ڈھونڈ لایا گیا
دفعتاً تب یہ احساس پیدا ہوا
گوشت اور پوست کی ایک چرخی ہوں میں
ایک پہیہ ہوں میں، گشت کرتا ہوا
اشتہا مِٹ گئی پیٹ کی، جسم کی
رُوح پیاسی تھی ویسی ہی پیاسی رہی
میرے عزمِ سفر نے مجھے کیا دیا
شرق سے غرب تک ایک پھیلا ہوا فاصلہ، فاصلہ!

(۴) پھیلاؤ

جب مرے جسم سے کونپلیں پھوٹ کر
دھیرے دھیرے تناور شجر بن گئیں
اور پھل پھول دینے لگیں، تب مجھے
ایک احساسِ گیرائی ایسا ہوا
جیسے جو بھی زمیں پر ہے سب میرا ہے
اس کے غم، اس کی خوشیاں بھی سب میری ہیں
اس کی تنہائیاں، بے بسی، کرب، سب
جو بھی اس کا مقدر ہے سب میرا ہے
صرف میری وجہ سے ہے، خالق ہوں میں
ہر کم و بیش کا، جیسے میں ہوں زمیں
اور جیسے کہ میں خود ہی دہقان ہوں

(۵) بچّوں کو کھیلنے دو

مدرسے آج بھی تازہ و گرم ہیں
صحنِ مکتب میں اطفال کا شور ہے
پَر وہ اُستادِ شعلہ بیاں مر گیا
جس نے دیوارِ مکتب پہ لکھوایا تھا
"عام انسان بھیڑوں کا وہ گلّہ ہے
جس کو چرواہے ہر حال میں چاہییں
خون اور نسل ہی معتبر جنس ہے"
اور وہ طفلِ مکتب ابھی زندہ ہے
جو ٹھٹھرتے ہوئے کُتّے کے پلّے کو
پیرہن میں چھپا لایا تھا راہ سے

(۶) سچ کا جنگل

پیر و مرشد، گرو، رہنما، سب کے سب
مشعلیں ہاتھ میں تھامے آگے جو تھے
جانے کس گام پر سب الگ ہو گئے
سچ کا جنگل ہے چاروں طرف اور میں
خود سے بیزار، ایسی جگہ ہوں کھڑا
چاروں جانب سے راہیں جہاں آن کر
ایسے مِلتی ہیں، اک جال سا بُن گیا
اور اس جال میں ان گنت مکھیاں
پھنس گئیں، بھنبھناتی ہیں پھِر بھی مگر
کوئی صورت نہیں ان کے چھٹکارے کی

(۷) کوہِ ندا کا بُلاوا

یا اخی! یا اخی! یا اخی! یا اخی!
پَو پھٹے، دن ڈھلے، رات کی تیرگی
روزِ روشن کے بہتے ہوئے نُور سے
میں یہ آواز، یہ نغمۂ سرمدی
میں بُلاوا، یہ نزدیک اور دُور سے
آج تک روزِ اوّل سے سنتا رہا
آج بھی میرے کانوں میں ہے یہ صدا
"یا اخی! یا اخی! یا اخی! یا اخی!
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا"

(۸) مکاں لا مکاں

کس نے فانوس ٹھنڈے کیے، کون تھا؟
کیسی آہٹ تھی، سیدھے کرو شمع داں
خادمو، سُست خُو مردکو، زنگیو
خانہ زادو، ابھی کون تھا یہ یہاں؟
زر خریدو، ہواخواہو، دیکھو، بڑھو
چاپ قدموں کی کیسی تھی، یہ سائے سے
طاق و محراب و منبر پہ رقصاں تھے کیا
کون تھا جس نے فانوس ٹھنڈے کیے
شہر کے در مقفل کرو، روک لو
چھان ڈالو، گلی کوچے، بازار، کیا؟
صرف راکب ہے، مرکب کبھی کا گیا؟

(۹) اتمامِ سفر سے پہلے کا پڑاؤ

ارضِ سبز و سیہ، ابیض و سُرخ سے
میں گزرتا ہوا جاؤں گا، کوئی ہے؟
کوئی ہے ہم سفر میرا، کوئی نہیں
اس مُسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی
جو تمھارا تھا، میں نے تمھیں دے دیا
اور جو جس کا ہو مجھ سے لے لے ابھی
کل نہ کہنا مری بات میں کھوٹ تھا
کل نہ کہنا مری ذات آلودہ تھی

جب گھڑی بند تھی

وقت سے بے خبر بھی رہو
صبح تو آئے گی
شام تو جائے گی
شام اور صبح کے بین جو رنج ہیں
اور خوشیاں ہیں جو
خودبخود ساتھ ہو جائیں گے
جب گھڑی بند تھی
کیا سبک رو پرندوں کا اُڑنا معطّل ہوا
بحرِ ذخار کی موجہ سُست رَو
موجہ تیز خو
کیا کبھی ایک لمحہ کو غافل ہوئی
جب گھڑی بند ہو گی تو کیا
دردِ گیتی بھی سو جائے گا؟
ہم سوادِ وطن سے کہیں دُور ہوں
درد سے چُور ہوں
یا سوادِ وطن ہی میں رنجور ہوں
جب گھڑی بند ہو گی تو کیا بیتنے والے پل
چھاؤں پا کر، کہیں سب ٹھہر جائیں گے
وقت سے پہلے مر جائیں گے!

۱۹۸۱

راستہ کا سوال

میں جب آیا، راہگذر نے پوچھا
اتنے سال کہاں تھے؟
موٹے موٹے سے لگتے ہو
مستقبل کو محفوظ بنانے کی کوشش میں سرگرداں تھے؟
کنپٹیوں کے بال بھی سب کھچڑی ہونے کو آئے ہیں
اتنی محنت کی ہے، کیا کچھ جوڑا؟
سرکاری عمّال نے کیا کیا فردِ جرم لگائی اس محنت کے حاصل پر؟
شہرت کی بے حد خواہش تھی تم کو
کتنے زینے باقی ہیں اب آخری سیڑھی تک جانے کو؟
شہر کے رُتبے والے لوگوں میں آتے جاتے ہو؟
داد و تحسین ضروری ہے اس انتھک محنت کی
کیا کوئی گل رُو بھی تم پر مرتا ہے
یا ایسے ہی دن کی رات کیا کرتے ہو؟
سناٹے سے بات کیا کرتے ہو؟
وہ گھر جس میں جینے کا آغاز کیا تھا
کیا اس گھر کی سیلن، دیواروں کی بُو ذہن میں اب تک باقی ہے؟
اور وہ گھر جس میں تم اب رہتے ہو
اس کے غرفے اور دریچے حسبِ عادت وا رکھتے ہو؟

کیا ان غرفوں اور دریچوں سے تم کو ایسی آوازیں آتی ہیں
جن سے ظاہر ہو دنیا میں بے حد بے چینی ہے؟
کیا ان غرفوں اور دریچوں سے بارود کی بُو
بے بس اور نہتے لوگوں پر بم گرنے کی آوازیں آتی ہیں؟
ماؤں کے رونے، بچّوں کے چلّانے، باپ اور بھائی کے قتل کا چرچا سننے میں آتا ہے؟
جس میں تم رہتے ہو، یہ گھر کتنی اونچائی پر ہے؟
کیا اس گھر سے بیروت کی گلیوں میں بکھری لاشیں دیکھی جا سکتی ہیں؟
کیا تم اب تک حبّ الوطنی کے قائل ہو؟
وہ اعلیٰ حکّام جو ملکوں ملکوں مسندِ اعلیٰ پر بیٹھے ہیں
ان کی ذہنی حالت پر کچھ شک نہیں ہوتا تم کو؟
راہگذر نے اتنی باتیں پوچھیں، میں گھبرا کر بھاگا
راہ کی دوسری جانب ایک گڈھا تھا
بے دھیانی میں ٹھوکر کھا کر اس میں پھسلا
بعد میں مجھ پر اور دنیا پر کیا گزری، یہ آپ بتائیں!

۱۹ جنوری ۱۹۸۳

دِلّی کی گلیاں (تین منظر)

پہلا منظر

سن انیس سو اڑتیس ہے
سردی کی ٹھٹھری راتیں ہیں
رات کے کوئی آٹھ بجے ہیں
آج یہ سب گزری باتیں ہیں
موری دروازے کے باہر
نشے میں دھت فوجی گورے
انگریزی سرکار کے چھورے
تانگے والوں کو پیٹ رہے ہیں
تانگے والے گھبرا گھبرا کر
اِدھر اُدھر سب بھاگ رہے ہیں
اور سپاہی آنکھ چُرا کر
دوسری جانب دیکھ رہے ہیں
چلتے چلتے راہ میں رُک کر
میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں

دوسرا منظر

فتح پوری مسجد کے آگے
چاندنی چوک کا لمبا رستہ
لال قلعہ تک لے جاتا ہے

ہاتھ میں تھامے اپنا بستہ
میں مکتب کی سمت رواں ہوں

شاہجہاں کے لال قلعہ پر
گوروں کا پہرا بیٹھا ہے
چاندنی چوک میں دائیں بائیں
گلیوں، کوچوں، بازاروں میں
بجلی کے کھمبوں پر ہر سُو
ڈھیروں لڑکے چڑھے ہوئے ہیں
اور تاروں کو کاٹ رہے ہیں
پولیس گولی چلا رہی ہے

چلتے چلتے راہ میں رُک کر
میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں

تیسرا منظر

گورے لندن چلے گئے ہیں
مانگیں پوری ہو گئیں آج
نیتا، راہ نما سب خوش ہیں
ملک نے پایا ہے سوراج
لال قلعہ پر آزادی کا

سہ رنگا پرچم لہرایا
دِلّی کی گلیوں میں سب نے
آزادی کا جشن منایا
لیکن ایکا ایکی جیسے
پردہ اُٹھا، منظر بدلا
دھند سی چھائی ہے ہر جانب
جو کچھ ہے، سب گدلا گدلا
کوئی نہیں سنتا ہے کسی کی
ہو گئے لوگ اچانک بہرے
ریلوں میں بے سر کی لاشیں
سڑکوں پر بے دھڑ کے چہرے
ہریجن بستی کی کٹیا میں
خون سے لت پت لہو لہان
کٹیا جیسے اک شمشان
گاندھی جی کی لاش پڑی ہے
آزادی کچھ دور کھڑی ہے

۲۷ جنوری ۱۹۸۲

حُسن پَرست

جیسے تم بیٹھیں تھیں، اُس طرح نہ بیٹھی ہوتیں
گر میں اُس روز اچانک نہ وہاں آ جاتا
وقفہ وقفہ سے تمھارا وہ مجھے دیکھنے کا
بے تعلق سا، تعلق بھرا، انداز نہ گر بھا جاتا
ایک اسی حادثہ کے ہونے سے اس لمحہ تک
میں یہی سوچتا رہتا ہوں شبانہ امروز
میرے جینے کا بھی انداز الگ کچھ ہوتا
تم بھی شاید کبھی تو بچے نہ پیدا کرتیں

۲۵ جنوری ۱۹۸۳

بے نام جذبہ

میں اچھی اچھی نظمیں لکھوں
ایسی نظمیں جن کی کوئی مثال نہیں ہے
ایسی خواہش اکثر دِل میں پیدا ہوتی ہے
کیوں، اس کا کوئی تسلّی بخش جواب نہیں ہے
جو میں آپ کو دے دوں!

جب میں نے چلنا سیکھا تھا اس وقت کے سارے رستے
تعمیریں گھر آنگن بستی کے چوراہے
باتیں کرنے کا انداز بیان و لہجہ
لوگ اچھے اچھے، چاہے اَن چاہے
سب کچھ بدلا بدلا ہے اپنے ماضی سے کٹا کٹا ہے
کیوں، اس کا کوئی تسلّی بخش جواب نہیں ہے
جو میں آپ کو دے دوں!

پیارے پیارے بچّے آپس میں لڑتے بھڑتے
رات اور دن کی بانہوں میں بانہیں ڈالے
مرتے دم تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتے
خونِ دِل سے مستقبل کی تعبیریں لکھتے
شانہ سے شانہ جوڑے بڑھتے جاتے ہیں

لیکن جب روٹی کی جہد میں
کٹتی ملتی راہوں پر ٹکراتے ہیں
دشمن ہو جاتے ہیں
کیوں، اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے
جو میں آپ کو دے دوں

طالبِ علم، مدرّس، مکتب کی دیواروں میں گھر کر بیٹھے
سقراط، ارسطو، رومی اور فلاطون کو پڑھتے ہیں
گوتم، عیسیٰؑ اور محمدؐ کا چرچا کرتے ہیں
اپنی تخلیقات کے صفحوں پر موتی سے جڑتے ہیں
آدرش انسان، اعلیٰ قدروں کو نصب العین بناتے ہیں
لیکن جب مکتب سے باہر جاتے ہیں
چانکیہ، میکاولی
یا ان کے بھائی بندوں کی راہ پہ چلنے لگتے ہں

کیوں، اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے
جو میں آپ کو دے دوں!

۲۰ جنوری ۱۹۸۳

تحلیل

میری ماں اب مٹی کے ڈھیر کے نیچے سوتی ہے
اس کے جملے، اس کی باتیں، جب وہ زندہ تھی، کتنا برہم کرتی تھیں
میری روشن طبعی، اس کی جہالت
ہم دونوں کے بین اک دیوار تھی جیسے
"رات کو خوشبو کا جھونکا آئے، ذکر نہ کرنا
پیروں کی سواری جاتی ہے"
"دن میں بگولوں کی زد میں مت آنا
سائے کا اثر ہو جاتا ہے
"بارش، پانی میں گھر سے باہر جانا تو چوکس رہنا
بجلی گر پڑتی ہے، تو پہلوٹی کا بیٹا ہے"
"جب تو میرے پیٹ میں تھا، میں نے اک سپنا دیکھا تھا
گود میں اپنی سانپ لیے بیٹھی ہوں۔ تیری عمر بڑی لمبی ہے
لوگ محبت کر کے بھی تجھ سے ڈرتے رہیں گے!"
میری ماں اب ڈھیروں مَن مٹی کے نیچے سوتی ہے
سانپ سے میں بے حد خائف ہوں
ماں کی باتوں سے گھبرا کر میں نے اپنا سارا زہر اگل ڈالا ہے
لیکن جب سے سب کو معلوم ہوا ہے میرے اندر کوئی زہر نہیں
اکثر لوگ مجھے احمق کہتے ہیں

۲۰ جنوری ۱۹۸۳

نشاۃ ثانیہ

موسموں کے بدلنے کا منظر تو پیچھے کہیں رہ گیا
کھیت کی منڈیر پر چھاؤں میں شیشموں کی
بھرے کنڈ میں!
جامنوں کے گھنے جھُنڈ میں
کوئلوں اور پپیہوں کی آواز کے شور میں
امڈے جذبات کے زور میں
وقت یوں بہہ گیا جیسے آنسو کا قطرہ تھا، بے مایہ سا
قہقہہ تھا جو پھولوں کی خوشبو میں گھُل مِل گیا
کتنے کردار ہیں سامنے
ہنستے روتے ہوئے
زندگی کی کشاکش میں الجھے ہوئے
عشق کرتے ہوئے، آہیں بھرتے ہوئے
جانِ راحت پہ ہر آن مرتے ہوئے
بے خبر ساری دُنیا سے اک دوسرے کو سنبھالے ہوئے
ہاتھوں کو چومتے، بوسے آنکھوں کو دیتے ہوئے
بہتے جاتے ہیں موجِ رواں کی طرح
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے
ایک دیکھی ہوئی فلم کا ایسا منظر ہے یہ
جس کے کردار اب گویا افسانہ ہیں

فلم بوسیدہ اتنی ہے، چلتے ہوئے ٹوٹ جاتی ہے، پھر جوڑتا ہوں اسے
جوڑ کر پھر چلاتا ہوں، خوش ہوتا ہوں
گاہے روتا ہوں مَیں
اک بہت خوبصورت سی رنگین تصویر ہے
کتنے لمحات میرے بھی اس فلم میں بند ہیں
وہ جو دھندلا سا چہرہ نظر آرہا ہے تمھیں
پیڑ کی آڑ میں
وہ، جہاں سادہ کپڑوں میں
اک مہ جبیں ہنس رہی ہے کھڑی
اس کے بائیں طرف، میں ہوں وہ
اتنی دِلکش کہانی ہے، جی چاہتا ہے کہ پھر سے بَنا لوں
پر وہ چہرے جو اس فلم کی جان ہیں
وہ کہاں ہیں؟
انھیں کس طرح
کیسے لاؤں گا میں؟

۴ فروری ۱۹۸۳

کہاں تک . . .

ہر نئی راہ سے مَیں پوچھتا ہوں
اے مری صبحِ سفر، شامِ حیات
تو مرا ساتھ کہاں تک دے گی؟
کیا ٹھہر جائے گی اک موڑ پہ کچھ گام کے بعد
اور میں شام و سحر، جیسے ہیں گردش میں یونہی
سرگرانی بھی رہی، چلتا رہوں گا پھر بھی
اے مری راہِ نجات و ظلمات
تو مرا ساتھ کہاں تک دے گی؟

عظمتِ صبح اندھیروں نے نِگل لی ہے مگر
قصرِ امّید میں پھیلا ہے اُجالا پھر بھی
چاند گہنا گیا افکار کا، حالات زبوں، دہر ملول
گِرد اس کے ہے مگر نُور کا ہالہ پھر بھی
کون سے موڑ پہ چھوڑے گی مجھے کچھ تو بتا
اے مری گرمیِ جذبات کہاں تک جاؤں
میں ترے ساتھ کہاں تک جاؤں
تو مرا ساتھ کہاں تک دے گی؟

۱۰ جنوری ۱۹۸۴

فصل ۹

زمین زمین، اشاعت ۱۹۹۰

پیش لفظ: اختر الایمان

رخشندہ کتاب گھر، بمبئی

کربلا

بہت سے لوگ تھے اب جن کے نام یاد نہیں
جو یاد ہے تو ہرے نیم کی گھنی چھاؤں
نبولیوں سے پٹا فرش، کوئلوں کی صدا
جو یاد ہے تو کوئی اونگھتا ہوا گاؤں
بہت سی اٹھتی بہاروں کو بازوؤں میں لیے
جو یاد ہے تو کئی شہر، جبر، واویلا
بلند چمنیاں مصروف کارخانوں کی
بَلا کی طرح دھواں رات دن سے لپٹا ہوا
بِھڑوں کے چھتے کی صورت نئے مکانوں کی
ہر ایک لمحے کا حاصل ہے ایک پچھتاوا
بہت سے لوگ تھے اب جن کا ساتھ یاد نہیں
کریں جو بات تو کانوں میں شہد گھل جائے
جو چپ رہیں تو سرِ کوہسار کا منظر
چلیں تو تختِ رواں پر حیات سی رقصاں
پلٹ کے دیکھیں بڑے اعتبار کا منظر
تمام شعلۂ گل، برق و جلوہ، رامش و رنگ
تمام صحنِ چمن میں بہار کا منظر
ہم ان کو کون سی منزل پہ رہ میں چھوڑ آئے

بہت سے دھاگے تھے کچھ پائیدار کچھ بودے
سبب تو یاد نہیں آج سب کو توڑ آئے
بڑے عذاب کی راہوں سے ہو کے آئے ہیں
جو یاد رہتا بھی کیا، ایسا حافظہ تو نہیں
تمام نالہ و شیون تھا تشنگی تھی وہاں
جہاں سے گزرے ہیں یہ دشتِ کربلا تو نہیں

۲۹ جون ۱۹۸۵

صبحِ کاذب

قلب پر، چشمِ بینا پہ، گفتار پر
سُننے، محسوس کرنے پہ، اظہار پر
بے حسی ثبت ہے، درد کے شہر میں
گرد کے، مرد نامرد کے شہر میں
مُردنی ثبت ہے، بے رُخی ثبت ہے
بُود نابُود سے، سُود بے سُود سے
شعلہ و دُود سے، دَورِ نمرود سے
جب مُجھے کوئی شکوہ شکایت نہیں
کیا ہوا میری آواز کیوں بند ہے

۲۹ جون ۱۹۸۵

منبر پہ کھڑے لوگو
ہیروں سے جڑے لوگو
سونے سے مڑھے لوگو
ہر ضابطہ سے باہر
ہاتھی سے بڑے لوگو
کُچھ ایسی بنا ڈالو
آلام بھری دُنیا
رہنے کی جگہ ہو جائے
کہنے کی جگہ ہو جائے
حالات پہ قابُو ہے
انسان فقط شر ہے
شیطان سے بڑھ کر ہے
یہ تہمتیں ہٹ جائیں

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۶

اور اَب سوچتے ہیں

دُور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
ہفت خواں طے کیے، ظلمات سے گزرے بھٹکے
وسعتِ دشتِ تمنا میں، سراسیمہ، زبوں، آبلہ پا
رات دن چلتے رہے ایک لگن دل میں لیے
راہ کی گرد چھٹے، کرب سے مِل جائے نجات
دُور تھی منزل مقصود مگر چلتے رہے
عمر کے موڑ پر آئے تو کشش و پیچ میں ہیں
اور اب سوچتے ہیں منزلِ مقصود تھی کیا

۲۱ مارچ ۱۹۸۸

گُریز پا

ہوا میں سرمستیاں گھلی تھیں، لہو میں نغمے بھرے ہوئے تھے
گلوں کی خوشبو کے موسموں کا زمانہ کتنا بھلا بھلا تھا
زمیں پہ رکھتے تھے پاؤں ایسے، ہمیں نے تخلیق کی تھی جیسے
رفیق جاں بخش قہقہے تھے، فضا میں نشہ مِلا ہوا تھا
مدارتیں، میٹھی میٹھی چہلیں، صنم تھے مہر و وفا مجسّم
دھنک میں جھولے پڑے ہوئے تھے، تمام منظر سجا سجا تھا
خبر نہیں تھی دوا کی بُو باس بھی ہے شامل رفاقتوں میں
تمام گل پوش موسموں کا زمانہ اتنا گُریزپا تھا
پڑا تھا میں سینہ چاک آگے، لہو میں ڈوبا ہوا تھا نشتر
کھڑا تھا جرّاح سانس روکے، زمانہ کچھ دیر تھم گیا تھا
یہ روز و شب ہیں، یہ ماندگی ہے تو کیا بھروسا کریں کسی کا
وہ دِل ہی سب منحصر تھا جس پر، ہوا نشانہ شکستگی کا

۲۳ ستمبر ۱۹۸۸

خواب کا سفر

سکوں طلب دل و جاں اور زمانہ پُر آشوب
تلاش کیا تھی مِلا کیا، جہانِ فتنہ شعار
پلٹ کے جائیں تو کیسے، ہے ایک طرفہ سفر
کھڑی ہے راہ کو روکے انیت کی دیوار
قدم بڑھائیں تو کس سمت، ایک خوف و ہراس
محاصرہ کیے بیٹھا ہے ذہن کا، افکار
شکست خوردہ، عمل ایک فعلِ سوختہ جاں
وہ دور بین کہاں ہے جو گرد کے اس پار
جو ہونے والا ہے وہ دیکھ لے، بتا بھی دے
ہم اپنے تن میں سمٹ جائیں یا کریں اظہار
بلند حوصلہ ہم ہیں، شکست کیوں مانیں
یہ ممکنات کی دنیا ہے راستے ہیں ہزار
اس انتشار میں، اس گومگو کے عالم میں
وہ یاد آتے ہیں، خوش کن، تمام باغ و بہار
سکوں نواز، خرد مند، لالہ زار سے لوگ
بھلے بھلے سے، جہاں ساز، بردبار سے لوگ

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۸

کارنامہ

عظیم کام کروں کوئی، ایک دن سوچا
کہ رہتی دُنیا میں اپنا بھی نام رہ جائے
مگر وہ کام ہو کیا ذہن میں نہیں آیا
پیمبری تو زیاں جان کا ہے، دعویٰ کیا
تو جانے سُولی پہ چڑھنا ہو یا چلیں آرے
کہ زندہ آگ کی لپٹوں کی نذر ہونا پڑے
خیال آیا فنونِ لطیفہ ڈھیروں ہیں
صنم تراشی ہے، نغمہ گری کہ نقاشی
یہ سب ہی دائمی شہرت کا اک وسیلہ ہیں
مگر نہ لفظوں پہ قدرت، نہ رنگ قابُو میں
پھر ایک ذریعہ سیاست ہے نام پانے کا
علاوہ نام کے، مہرے بنا کے لوگوں کو
بساطِ ارض پہ شطرنج کھیل سکتے ہیں
مگر یہ فن بھی مری دسترس سے باہر تھا
پھر اور کیا ہو، بہت کُچھ خیال دوڑایا
علاوہ ان کے مُجھے اور کُچھ نہیں سُوجھا

زمانے بعد سمندر کنارے بیٹھا تھا
عظیم شئے ہے سمندر بھی میرے دِل نے کہا
وہ کیا طریقہ ہو میں اس کا بھاگ بَن جاؤں
سمجھ میں آیا نہیں کوئی راستہ بھی جب
تو جھنجھلا کے سمندر میں کر دیا پیشاب

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸

کفّارہ

اس جہاں میں بارہا آیا ہوں میں
طے نہیں پایا ابھی تک کیا ہوں میں
رینگتے پھرنا زمیں پر اور کبھی پرواز میں
جلوہ گر ہوتا رہا ہوں مختلف انداز میں
خار و خس میں سبزہ و گُل میں کبھی
برگِ نے میں سرو و سنبل میں کبھی
خاک سے اُٹھ کر بگولوں میں اڑا پھرتا رہا
مینہ بَن کر بادلوں سے خاک پر برسا کیا
وسعتِ صحرا میں سورج کی تپش سہتا رہا
پانیوں میں تیز رَو دریاؤں کے بہتا رہا
ہرطرح کے رنگ میں رمتا رہا، آیا گیا
ہر نئی صورت میں میری ذات جاں افزا ہوئی
آدمی کی شکل میں آیا، زمیں رُسوا ہوئی

۱۰ مئی ۱۹۸۹

باز گشت

کہیں تو کچھ ہوا ہے یہ تبسّم میں جو خفگی ہے
کوئی لڑکا ہی ہوگا جس کی باتوں کا خیال آیا
عجب سا، بے تکا سا، نابلد رسمِ جوانی سے، لگاوٹ سے
تمھیں دیکھا تھا جس نے اور چہرے پر سوال آیا
سوالوں سے بھری دنیا ہے یہ ناراض مت ہونا
نہ چاہو تو مقدرسوز کی دمساز مت ہونا
کہیں ایسا نہ ہو پُروائی بن کر آج اُڑ جاؤ
مگر جب جب خیال آئے تو سوچو اور پچھتاؤ
کہ اس پہلی نظر میں جو طلب تھی، جیسی گرمی تھی
عجب سی نارسائی تھی، تمازت خیز نرمی تھی
وہ کیفیت، وہ لاچاری کہیں تم نے نہیں پائی
وہ پہلی شدّتِ احساس کیوں مڑ کر نہیں آئی
تمہارے جسم کو یوں دوسری آغوش مِل جائے
مگر اک تشنگی سی زندگی بھر تم کو تڑپائے

۲۵ جون ۱۹۸۹

ڈھلان

وہ پیچھے رہ گیا سب جس نے دِل کو گُدگُدایا تھا
ہنسے جانا یونہی بے بات، قربت ہم نشینوں کی
دوپٹوں میں دھنک کے رنگ، چاہت مہ جبینوں کی
کھنک سے چوڑیوں کی بے طرح سرشار ہو جانا
پسِ پردہ کسی کی نقرئی آواز کا بیمار ہو جانا
بھٹکنا چاندنی راتوں میں سڑکوں پر جگرکاوی
بلا وعدہ کسی کا منتظر رہنا، کم آگاہی
کسی کی بے لگاوٹ بات کو معنی دیے جانا
کسی کا ذکر سن کر دِل میں ڈھیروں وسوسے لانا
کنول کے پھول، نیلوفر کے پودے دیکھ کر دِل کا
مچلنا بے طرح سے اور قابو سے نکل جانا
اُترنا بے خطر تالاب کے سُن، گہرے پانی میں
مزہ لینا ہر اک سے چھیڑ میں اک سرگرانی میں
کسی کے باغ میں چوری سے گھس کر جامنیں کھانا
بہانے سے، گھروں سے دوستوں کے، اُن کو بلوانا
برستے پانیوں میں بھیگنا، نادانیاں کرنا
ہوائے شوق میں اُڑنا خیالِ خام پر مرنا
وہ سب طفلانہ باتیں، واقعے الھڑ جوانی کے
بس اک یہ سلسلے ہیں آج اک بیتی کہانی کے

نکل آئے خیابانوں سے دلکش وادیوں سے مرغزاروں سے

وہ خوشبو زار، میلے، مسکنِ گل رہ گئے پیچھے
نہ پہلے تھا نہ اب معلوم کیا جانے ہے کیا آگے
یہ رخشِ عمر تو رَو میں ہے کب جانے کہاں ٹھہرے

۱۶ جولائی ۱۹۸۹

خمیر

گلاب کیکر پہ کب اُگے گا
کہ خار دونوں میں مُشترک ہے
مَیں کِس طرح سوچنے لگا ہوں
مُجھے رفیقوں پہ کتنا شک ہے
یہ آدمیّت عجیب شئے ہے
سرشت میں کون سا نمک ہے
کہ آگ، پانی، ہوا، یہ مٹّی
تو ہر بشر کا ہے تانا بانا
کہاں غلط ہو گیا مرکّب
نہ ہم ہی سمجھے، نہ تم نے جانا
غریب کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں
ہوا تولّد تو شاہ زادہ
بلند مسند کے گھر پیادہ
ولی کے گھر میں حرام زادہ

۱۵ جولائی ۱۹۸۹

اچانک

پیل تن پیڑ جب گر گئے
وسوسوں نے بہت سخت یلغار کی
اب کہاں ایسی چھاؤں ملے گی ہمیں
راستہ روک کر بولی کم ہمتی
بے دِلی سی مسلط ہوئی ذہن پر
دن پہ چھانے لگی رات کی ماندگی
یونہی بے سمت چلتا رہا میں کہ لو
آگئی سامنے دفعتاً وہ گلی
جس کی دِل بستگی کو بہت چاہ تھی
دوسری سمت جس کے نئی راہ تھی

۲۵ جولائی ۱۹۸۹

اپاہج گاڑی کا آدمی

کچھ ایسے ہیں جو زندگی کو مہ و سال سے ناپتے ہیں
گوشت سے، ساگ سے، دال سے ناپتے ہیں
خط و خال سے، گیسوؤں کی مہک، چال سے ناپتے ہیں
صعوبت سے، جنجال سے ناپتے ہیں
یا اپنے اعمال سے ناپتے ہیں
مگر ہم اسے عزمِ پامال سے ناپتے ہیں

یہ لمحہ جو گزرا مرے خون کی اس میں سُرخی ملی ہے؟
مرے آنسوؤں کا نمک اس کی لذّت میں شامل ہوا ہے؟
پسینے سے گرداب ساحل ہوا ہے؟
یہ لا کا سفر لا رہے گا کہ کچھ اس کا حاصل ہوا ہے
کہ جیسی تھی برسوں سے ویسی ہی تشنہ دِلی ہے؟

میں کب سے زمیں پر زمیں کی طرح چل رہا ہوں
یہ دیوانہ اندھا سفر کب کہاں جا کے چھوڑے گا مُجھ کو؟
میں اس زندگی کی بہت سی بہاریں غذا کی طرح کھا چکا ہوں
پہن اوڑھ کر پیرہن کی طرح پھاڑ دی ہیں

میں ریشم کا کیڑا ہوں، کویے میں چھپ جاتا ہوں ڈر کے مارے
اسی کویے کو کھاتا رہتا ہوں اور کاٹ کر اس سے آتا ہوں باہر
اور اپنے جینے کا مقصد، سبب جاننا چاہتا ہوں
مِرا دِل خدا کی رضا ڈھونڈتا پھر رہا ہے
مِرا جسم لذات کی جستجو میں لگا ہے
گذر گاہِ شام و سحر پر کہیں ایک دن میں اگا تھا
نباتات کی طرح جیتا ہوں اس کارگاہِ جہاں میں
نہ احساس، ایمان، ایقان کوئی
نہ دنیا میں شامل، نہ خود اپنی پہچان کوئی
گنہ اور جہنّم، ثواب اور جنّت؟
یہ کیوں ہے کہ بے مُزد کچھ بھی نہیں مِل سکا ہے
نہ کل مِل سکے گا
اساطیر، فرماں رواؤں کے احکام اور صوفیا کی کرامت کے قصّے
پیمبر کی دِل سوزیوں کے مظاہر
قلم بند ہیں سب!
انھیں ہم نے تعویذ کی طرح اپنے گلوں میں حمائل کیا ہے
انھیں ہم نے تہہ خانوں کی کوٹھری میں مقفل کیا ہے
جہاں لڑکھڑاتے ہیں ان کی مدد لے کے چلتے ہیں آگے
مگر راستوں کا تعیّن نہیں ہے!

میں بکھرا ہوا آدمی ہوں
مری ذہنی بیماریوں کا سبب یہ زمیں ہے

اپاہج گاڑی کا آدمی

کچھ ایسے ہیں جو زندگی کو مہ و سال سے ناپتے ہیں
گوشت سے، ساگ سے، دال سے ناپتے ہیں
خط و خال سے، گیسوؤں کی مہک، چال سے ناپتے ہیں
صعوبت سے، جنجال سے ناپتے ہیں
یا اپنے اعمال سے ناپتے ہیں
مگر ہم اسے عزمِ پامال سے ناپتے ہیں

یہ لمحہ جو گزرا مرے خون کی اس میں سُرخی ملی ہے؟
مرے آنسوؤں کا نمک اس کی لذّت میں شامل ہوا ہے؟
پسینے سے گرداب ساحل ہوا ہے؟
یہ لا کا سفر لا رہے گا کہ کچھ اس کا حاصل ہوا ہے
کہ جیسی تھی برسوں سے ویسی ہی تشنہ دِلی ہے؟

میں کب سے زمیں پر زمیں کی طرح چل رہا ہوں
یہ دیوانہ اندھا سفر کب کہاں جا کے چھوڑے گا مُجھ کو؟
میں اس زندگی کی بہت سی بہاریں غذا کی طرح کھا چکا ہوں
پہن اوڑھ کر پیرہن کی طرح پھاڑ دی ہیں

میں ریشم کا کیڑا ہوں، کویے میں چھپ جاتا ہوں ڈر کے مارے
اسی کویے کو کھاتا رہتا ہوں اور کاٹ کر اس سے آتا ہوں باہر
اور اپنے جینے کا مقصد، سبب جاننا چاہتا ہوں
مِرا دِل خدا کی رضا ڈھونڈتا پھِر رہا ہے
مِرا جسم لذّت کی جستجو میں لگا ہے
گذر گاہِ شام و سحر پر کہیں ایک دن میں اگا تھا
نباتات کی طرح جیتا ہوں اس کارگاہِ جہاں میں
نہ احساس، ایمان، ایقان کوئی
نہ دنیا میں شامل، نہ خود اپنی پہچان کوئی
گنہ اور جہنّم، ثواب اور جنّت؟
یہ کیوں ہے کہ بے مُزد کچھ بھی نہیں مِل سکا ہے
نہ کل مِل سکے گا
اساطیر، فرماں رواؤں کے احکام اور صوفیا کی کرامت کے قصّے
پیمبر کی دِل سوزیوں کے مظاہر
قلم بند ہیں سب!
انھیں ہم نے تعویذ کی طرح اپنے گلوں میں حمائل کیا ہے
انھیں ہم نے تہہ خانوں کی کوٹھری میں مقفل کیا ہے
جہاں لڑکھڑاتے ہیں ان کی مدد لے کے چلتے ہیں آگے
مگر راستوں کا تعیّن نہیں ہے!

میں بکھرا ہوا آدمی ہوں
مری ذہنی بیماریوں کا سبب یہ زمیں ہے

مَیں اُس دن سے ڈرتا ہوں جب برف ساری پگھل کر
اس غرق کردے!
نئے آسمانی حوادث
صفر میں بدل دیں
یا آدمی اپنے اعمال سے خود
اسے اک کہانی بنا دے!
زمیں شورہ پشتوں کی آماجگہ بن گئی ہے

خدا ایک ہے یوں تو واوین میں صاف لِکھا ہوا ہے
مگر زیرِ واوین بھی چھوٹی چھوٹی بہت تختیاں ہیں
جلی حرف جن کے بہت اُمتوں کا پتہ دے رہے ہیں
جو یہ تختیاں اپنی گردن میں لٹکائے
زنار پہنے ہوئے، کوئی تسبیح تھامے
اپنی گردِ سفر کے دھندلکے میں لپٹے چلے جا رہے ہیں
زیتون کی شاخ، تُلسی کے پتّے
ہوا میں اُڑے جا رہے ہیں
چیونٹوں کی قطاریں قرن در قرن
مختلف پیچ در پیچ راہوں سے گزری چلی جا رہی ہیں
سینکڑوں سَر کٹے دھڑ بہت راستوں پر پڑے ہیں
ہَوَن ہو رہے ہیں
یگیہ کے منتروں کی صدا
آگ میں جلنے والی سامگری کی بہت تیز بُو

ہر طرف پھیل کر بس گئی ہے ہوا میں
اور واوین کی قید میں جو خدا ہے
لا مکاں سے
جو ہوتا ہے، ہوتا رہے گا
بیٹھا چُپ چاپ سب دیکھتا ہے

ہم بھی کیوں نہ خدا کی طرح یونہی چپ سادھ لیں
پیڑ پودوں کی مانند جیتے رہیں
ذبح ہوتے رہیں!
وہ دعائیں جو بارود کی بُو میں بس کر
بھٹکتی ہوئی زیرِ عرشِ بریں پھر رہی ہیں
انھیں بھول جائیں
زندگی کو خدا کی عطا جان کر ذہن ماؤف کر لیں
یاوہ گوئی میں یا ذہنی ہزیان میں خود کو مصروف کر لیں
ان میں مِل جائیں جو زندگی کو
گوشت سے، ساگ سے، دال سے ناپتے ہیں
مہ و سال سے ناپتے ہیں
اپنا ہی خون پینے لگے ہیں
چاک دامانیاں غم سے سینے لگے ہیں

۲۳ جولائی ۱۹۸۹

عذاب

یہ جسم میرا نہیں ہے، تمام عمر مجھے
یہی خلش رہی، اور جسم ہے اگر میرا
تو روح میری نہیں، قید کر دیا ہے اسے
کسی اک ایسے بدن میں جو ہے قفس اس کا
یہ سال اور مہینے، یہ دن گئے لمحات
اک ایسے کرب میں گزرے جو بے ثمر نکلا
مگر یہ میرا مقدر ہے اپنے آپ کو میں
عذابِ جاں سہی، اس سے چھڑا نہیں سکتا

۲۸ جولائی ۱۹۸۹

نہ مرنے والا آدمی

یہ مٹی بوئے خوں آتی ہے جس کے لالہ و گل سے
یہی میری زمیں ہے میرا مولد میرا مدفن ہے
میں وہ قابیل ہوں جو لاش کاندھے پر لیے پھرتا ہے بھائی کی
ثمود و عاد کا وہ فرد ہوں جس پر فلک نے سنگ باری کی
میں وہ تاریخ کا پہلا ورق ہوں دست برد و جہدِ عالم سے
اچانک بچ گیا، سب کچھ رقم ہے ایک صفحے پر
میں لاشوں پر چلا ہوں خون کے دریا سے گزرا ہوں
مرا ورثہ ہے آنسو، بیکسی کی مَوت، بالادست کا نشتر
میں نوحہ خواں ہوں آبائی مزاروں کا مجاور ہوں
بہاروں کو کفن دیتا ہے جو وہ گورکن ہوں میں

۳ اگست ۱۹۸۹

میری گھڑی

کمبخت گھڑی نے جان لے لی
ٹِک ٹِک سے عذاب میں ہے جینا
جب دیکھو نظر کے سامنے ہے موجود
احساسِ زیاں نے چین چھینا
یوں سمجھو وبال ہو گیا ہے
ہر لمحہ، گزرتا سال اور مہینا
ہے ذہن پہ یوں سوار جیسے
بے رحم طلسم کی حسینا
رہ رہ کے دِلا رہی ہے احساس
لمحات کا بے کراں سفینا
اک موجِ ستم کی نذر ہوگا
ہر پَل کو سمجھ لے اک دفینا
یہ پَل نہیں آئے گا پلٹ کر
کھو جائے گا ہاتھ سے نگینا
لاحول ولا، ہٹاؤ جان چھوڑو
بخشو ہمیں، پھینک دو گھڑی کو

۸ اگست ۱۹۸۹

مکافات

عدم وجود کے مابین فاصلہ ہے بہت
یہ فاصلہ ہمیں اک روز طے تو کرنا ہے
وہ کشتِ گل ہو کہ ہم بوئیں راہ میں کانٹے
کوئی بھی فعل ہو پر ایک دن تو مرنا ہے
ہمارے پیچھے ہیں وہ بھی ہمیں عزیز ہیں جو
اسی طرف سے انھیں ایک دن گزرنا ہے
صبا بُریدہ بھی گل ہیں وفا گزیدہ بھی دِل
یہ بات ذہن میں رکھنی ہے اور ڈرنا ہے
کسی نے پہلے لگائے تھے سایہ دار شجر
انھیں کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں آج ہم آکر

۱۲ اگست ۱۹۸۹

ارضِ ناکس

کہاں لے جائیں گے پاؤں
کہاں جائیں گے اپنے آپ سے ہم بھاگ کر آخر
زمیں تو گول ہے، واپس یہیں آ جائیں گے اک دن
سرے جو زندگی کے کھو گئے ہیں اک اندھیرے میں
وہ مِل جائیں اگر آغاز اور انجام کیا ہو گا؟
مگر یہ ماورائی سلسلے گر چھوڑ دیں کچھ دن
یہ مابعدالطبعیاتی خلا کے اس طرف کی ساری دانائی
اسے رکھ دیں تجوری میں
تو شاید خون کے بحران سے آسودگی پا لیں
جہاں ہم دوڑتے ہیں پَو پھٹے سے ڈوبتے دن تک
غذا کی جستجو میں، چھاؤں میں آسودگی پانے
خزانوں کے لیے جس کا کلیجہ چیر دیتے ہیں
جھلستی دھوپ سے، بارش سے بچنے اور ستانے
بُجھانے پیاس اپنی جس کا سینہ چاک کرتے ہیں
زمیں جو سب کا مامن ہے
یہ گویا ارضِ ناکس ہے
اسے قحبہ سمجھ کر لوگ استعمال کرتے ہیں

کوئی والی نہیں، وارث نہیں اس کا
کوئی مجنوں نہیں، عاشق نہیں اس کا

بتانِ خوب رُو کی مدح میں اشعار کہنا بھی
خدا کی حمد کرنا ہے
سحر کا نور ہے ان کی جبینوں میں
شفق کی دِل ربائی ہے
قد و قامت میں پوشیدہ
بڑی شانِ خدائی ہے
لبِ لعلیں، یہ زلفیں
تبسّم بے خطا سا، موہنی باتیں
دبی آواز میں ہنسنا
چمن سازی دروں خانہ
مگر افسوس یہ شیشہ گری، یہ آبگینوں کی حسیں جھلمل
ملوّث ہے یہ سب ان زہر آلودہ بخاروں سے
بڑے صنعت گھروں سے جو نکل کر پھیل جاتے ہیں ہواؤں میں
ردائے دُود بن کر بام و در کو ڈھانپ لیتے ہیں
خوشی کی جستجو میں جو ہلاکت خیزیاں ایجاد کرتے ہیں
ہماری حرکتیں مذموم ہیں اور گفتگو بھی عامیانہ ہے
مگر تہذیب تو ایسا لبادہ ہے جسے لے کر
زباں پر پہنا جاتا ہے، بدن پر اوڑھا جاتا ہے
تمدن تو حسیں تعمیر کی چھت میں ہے، دیواروں میں، در میں ہے

رہائش کی سبھی آسائشوں میں جلوہ گر ہے وہ
مگر وہ خوف جس کے سائے میں سب جی رہے ہیں ہم
بہت سی زہر آلودہ مساعی کا نتیجہ ہے
زمیں پر ناسزا لوگوں کا قبضہ ہے
یہ ان کے دام میں ہے جن کے نطفے میں خرابی ہے
یہ وہ ہیں جن کے سر سجدے میں ہیں، نیّت دغا میں ہے
قسم کھاتا ہوں چڑھتے دن کی اس کی زیست پرور ان شعاعوں کی
تھکے ہارے بدن میں ایک بجلی سی جو بھرتی ہیں
قسم کھاتا ہوں اس انبوہ کے اُس کرب کی جو رات دن بے چین رکھتا ہے
انھیں دوڑائے پھرتا ہے زمیں کی وسعتوں میں اس طرح جیسے بگولے ہیں
قسم کھاتا ہوں تجدیدِ محبّت کرنے والی چشم میگوں کی
جو پیچھے رہ گیا اس کو پلٹ کر میں نہ دیکھوں گا
عقائد کی شکستہ صورتیں، پامال ارماں، فکر، اندیشے
ہمارے وصل کی اور ہجر کی راتیں، ہمارے آنسوؤں سے تربتر ہیں جو
ہمارے خواب خاک و خوں میں جو غلطاں ہیں اس دن تک
قسم کھاتا ہوں انسانی حمیّت اور غیرت کی
میں سب محرومیوں کو ایک بود و رفت کے تابوت میں رکھ کر
بہت گہری جگہ خود اپنے ہاتھوں دفن کر دوں گا
زمیں لاچار ہے، اس کا مداوا کچھ کرو، دیکھو

تم ایسا کیوں نہیں کرتے
بھلا یوں کیوں نہیں کرتے؟

یہ مانا قول پر اور فعل پر حیوان ہاوی ہے
پر ایسا کیوں نہیں کرتے؟
ذرا ٹھہرو بتاتا ہوں
مجھے کوئی نیا سا خواب پھر اک دیکھ لینے دو!

۲۶ جنوری ۱۹۸۷

تسلسل

قضا سے خوف مت کھانا
یہ آخرکار آتی ہے
مگر اک بار آتی ہے
ستاتی ہے بہت لیکن
کبھی روٹی کا ڈر بن کر
کبھی ناموس کا خطرہ
کبھی فردا کا اندیشہ
انا کی شکل میں آنا
کبھی پندار کا پھندا
بہت شکلیں بدلتی ہے
ہماری اور اپنی بھی
تبسّم بن کے آتی ہے
یہ طفلی ساتھ لاتی ہے
مگر طفلی کو جُل دے کر
لڑکپن کو رِجھاتی ہے
لڑکپن کو بھی چھلتی ہے
جوانی میں بدلتی ہے

جوانی کو دغا دے کر
بڑھاپا منہ پہ ملتی ہے
برابر ساتھ رہتی ہے
بہت منظر دکھاتی ہے
نہ آتی ہے نہ جاتی ہے

۱۹ اگست ۱۹۸۹

اک باغ تھا...

اک باغ تھا دِلکش سا
رہتا تھا جہاں مجھ سا
اک سبزۂ بیگانہ
اس باغ کے کیف و کم
اس باغ کے سب موسم
دیکھے تھے بہت میں نے
چکھے تھے بہت میں نے
خوشبو سے بھرے دن بھی
چاہت سے بھرے سِن بھی
اس باغ میں کاٹے تھے
دُکھ درد بھی بانٹے تھے
بارش کی پھہاریں بھی
مستی کی بہاریں بھی
اس باغ میں ٹوٹی تھیں
امیدیں بھی ٹوٹی تھیں
پت جھڑ بھی گزاری تھی
بازی یہیں ہاری تھی
کیا عرض کریں صاحب
اس باغ کے اک جانب

اللہ کا جلوہ تھا
عمرانہ کا کمرہ تھا
دن رات کا دورہ تھا
جو کچھ تھا وہی سب تھا
اپنا یہی مشرب تھا
جلووَں سے وضو کرنا
خواہش کو لہو کرنا
جذبات نہاں کرنا
آنکھوں کو زباں کرنا
لفظوں میں نہ کچھ کہنا
بس دیکھنا چپ رہنا
مجھ کو تھی بہت پیاری
یہ دولتِ دنیا ہی
جو کچھ تھا بھلا سا تھا
منظر بڑا اچّھا تھا
بس باغ کا گوشہ تھا
عمرانہ کا جلوہ تھا

مرغانِ چمن اکثر
گاتے تھے غزل مِل کر
یہ زادِ سفر کیا تھا
پھر بھی ہمیں دھڑکا تھا

جلوؤں کے ثوابوں کی
ارمانوں کے خوابوں کی
بارات نہ لُٹ جائے
سوغات نہ لُٹ جائے
وہ موڑ مگر آیا
رخصت ہوئی عمرانہ
شہنائی نے اس گھر کا
نقشہ ہی بدل ڈالا
ہنگامِ سحر اب بھی
گاتے ہیں مگر اب بھی
مرغانِ چمن سارے
ہم بیٹھے ہیں جی مارے

۱۴ اگست ۱۹۸۹

رویائے صادقہ

خلا میں گھورتا رہتا تھا وہ بیٹھا ہوا تنہا
لڑکپن ہی سے اس کو سوچتے رہنے کا سودا تھا
زمانے بھر کی باتیں، وسوسے اس کو ستاتے تھے
ہزاروں طرح کے اُلجھے خیالات آتے رہتے تھے
وہ سیارے جو لاکھوں میل کی دوری پہ ہیں ہم سے
وہاں آباد ہے کوئی کہ یونہی خاک اُڑتی ہے
بہت ایسے گرے ہیں جن کو گوناگوں سجایا ہے
زمیں کے واسطے بس ایک ہی مہتاب آیا ہے
زمیں کا مسئلہ یوں تو سراسر کائناتی ہے
یہ دانستہ بنائی ہے کہ امر حادثاتی ہے
فرشتے ڈھیر ہیں جو ہیں جمالِ یار کے شیدا
عبادت ہی کرانی تھی تو انساں کیوں کیا پیدا
خُدا کے پاس ہی تھا زندگی سے پہلے یہ خاکی
خُدا کو ڈھونڈتا رہتا ہے کیوں دُنیا میں آ کر بھی
نہ تھا کُچھ تو خُدا تھا کُچھ نہ ہو گا تو خُدا ہوگا
ذرا سوچیں مِلا ہے کیوں ہمیں یہ بیچ کا وقفا
اساسِ زندگی شاید غلط ہے بھوک سے ہٹ کر
یہاں کُچھ اور ہے، کیوں آدمی آیا ہے دھرتی پر

یہ مانا فرقِ این و آں بڑی حد تک شعوری ہے
گنہ کیا نیکیوں کی کھاد ہے، کرنا ضروری ہے
مِلا کیا آدمی کو بھید بھاؤ اور دوُری سے
خُدا جب ایک ہے تو اتنے مذہب کیوں ضروری تھے
وہ اکثر سوچتا تھا جب یہ دنیا ایک میلا ہے
تو انساں برسر پیکار ہیں کیوں، کیا جھمیلا ہے
یہ سارے فلسفے، دستور، دنیا کے طریقے سب
عبادت کے اصول، انداز، جینے کے سلیقے سب
بدل جاتے ہیں، بہہ جاتے ہیں لمحوں کی روانی میں
نہ جانے کتنے موڑ آتے ہیں چھوٹی سی کہانی میں
یہ خیر و شر کا تانا بانا، یہ آواگون محشر
خُدا جب قادرِ مطلق ہے، پھر کیسا ہے یہ چکّر
نہ جانے اور کیا کیا کچھ پریشانی کا باعث تھا
وہ لاکھوں الجھنوں کا صرف تنہا ایک وارث تھا

شبانہ روز کی اس فکر کے زیر اثر چہرہ
عجب اک بے نیازی شان و استغنے کا حامل تھا
بہت پہونچا ہوا صُوفی، ولی، مجذوب کہتے تھے
بہت سے اس کو رب الارض کا محبوب کہتے تھے
زمانے کے ستائے جانتے تھے معتبر اس کو
ضرورت مند گھیرے رہتے تھے شام و سحر اس کو

وہ مسجد تھا، وہ معبد تھا، وہ گرجا تھا، شوالہ تھا
بہت سی گوناگوں باتوں کا اس گِرد ہالہ تھا
سب اسرار و رموزِ دہر اس کی ذات میں گُم تھے
جڑے تھے ذات سے اس کی بہت حیران کُن قصے
قیافہ، غیب، جو سمجھو اسے یہ علم آتا تھا
وہ چہرہ پڑھ کے دِل کا حال سارا جان جاتا تھا
وہ اکثر وقت رہتا تھا پریشاں سا، بہت مضطر
سُنائی دیتی تھی آکاش وانی بھی اسے اکثر
بشارت ہوتی تھی خوابوں میں کیا کُچھ ہونے والا تھا
کہ اس کی دوُر بِینی کو اندھیرا بھی اُجالا تھا

اچانک بیٹھے بیٹھے، ایک دن اس دارِ فانی سے
وہ رخصت ہو گیا، کردار جیسے اک کہانی سے
مگر مرنے کے بعد اس کے ہوا مشہور یہ قصّا
کہ کُچھ دن پیشتر اس نے کُچھ ایسا خواب دیکھا تھا
حجر، ٹیلے، پہاڑ، اشجار سب کُچھ اس میں ڈوبا ہے
زمیں پر آسماں سے بے تحاشہ خون برسا ہے
پڑا گھمسان کا رَن آسمانوں میں بہے نالے
خُدا نے طیش میں آ کر فرشتے قتل کر ڈالے
سبب یہ تھا کہ آدم فطرتاً تھے نیک خُو، سادہ
مگر شیطان حرفوں کا بنا، موذی، شرر زادہ

فرشتوں کی مدد سے عِلم اس کو ہو گیا اس کا
گنہ آدم سے جو سرزد ہوا ہے اس کا کفارہ
یہ ہوگا، اس کو جنّت سے نکالا جائے گا حقّا
کہاں جائے گا اس کے بعد وہ، یہ سب خفا میں تھا
مسلسل کاوشوں کے بعد پھر اس پر کھُلا عقدہ
کسی کو کُچھ نہیں معلوم کیا پہنے گا، کھائے گا
زمیں ہے نام اس کا جس جگہ انسان جائے گا

زمیں کیا ہے، کہاں ہے، یہ تردّد، یہ پریشانی
عذابِ جاں بنی اس کے لیے، اور پھر یہ حیرانی
زمیں اسرار میں لپٹا کُرہ ہے، دوُر جنّت سے
خلا نے جس پہ اک کہرے کی چادر تان رکھّی ہے
ہوا میں عطر کی خوشبو ہے، سرشاری ہے، مستی ہے
فضا سے روُح پرور بے خودی سی اک برستی ہے
ڈھکی ہیں برف سے سب چوٹیاں اونچے پہاڑوں کی
پگھل کر برف اس دلکش کُرے کو دیتی ہے پانی
فرازِ کوہ سے دریا اتر کر سیر کرتے ہیں
کھُلے سرسبز میدانوں کی، یوں بادل اترتے ہیں
کنواری، بن چھوئی مٹّی پہ، جیسے اس پہ مرتے ہیں
لپٹ کر اس کے سینے سے تمنا پوری کرتے ہیں
پرندے، میٹھی آوازوں کے مالک، شوخ پر والے

سنہری، سرخ، شبگوں، سرمئی، بے رنگ، مٹیالے
پھدکتے، غل مچاتے، گیت گاتے، اُڑتے پھرتے ہیں
ہوا میں تیرتے، اُٹھتے، اُبھرتے اور گرتے ہیں
پٹی ہیں وادیاں پھولوں سے، تا حدِ نظر، ہر سُو
کلیلیں کرتے پھرتے ہیں حسیں وحشی، غزال، آہو
سبک پر تتلیاں، بھونرے، گلوں کے چاہنے والے
اُڑے پھرتے ہیں، کیفِ عشق سے سرشار متوالے
بہت سے اور جلوے منتظر ہیں چشمِ حیراں کے
کسی نے جو نہیں دیکھا وہ سب کچھ اس کُرے میں ہے
زمیں کے حسن کی تعریف نے شیطاں کو للچایا
حسد نے اس کے اندر تیز اک شعلہ سا بھڑکایا
وہ چلایا الاہ العالمین اس مُشتِ خاکی نے
کیا ہے کون سا جادو کہ مُجھ پر فوقیت دی ہے
عبادت کا صلہ یہ مُجھ کو دائم رُو سیاہی دی
گنہ کا اجر، آدم کو زمیں کی بادشاہی دی
اسے فوراً خیال آیا وہ ایسا کیوں نہ کر ڈالے
خس و خاشاکِ عالم میں بھڑکتا سا شرر ڈالے
کسی صورت فرشتوں کو کچھ ایسی بات سمجھائے
دھرا رہ جائے جو سوچا ہے، بازی ہی اُلٹ جائے

فرشتوں کو بٹھا کر سامنے کی ایسی لسّانی
مذبذب ہو گئے سب، چڑھ گیا شیطان کا پانی
کہے میں آ گئے سارے ملائک، مجلسِ شوریٰ
فطانت اور چالاکی نے مقصد کر دیا پورا
نتیجہ یہ ہوا آدم وہیں جنّت میں بیٹھا ہے
زمیں پر آدمی کی شکل میں شیطان آیا ہے

۱۵ اگست ۱۹۸۹

توازن

سڑک کے اک طرف عالی عمارت
اسی کے سامنے اک پھونس کا ڈھیر
یہاں کچھ لوگ رہتے ہیں وہاں کچھ
کچھ ایسا ہے زمانے کا اُلٹ پھیر
وہ پنپیں گے، یہ کچلے جائیں گے جب
یہ اُبھریں گے، نئی بُنیاد ہو گی
فنون ِ فکر و فن کی، عہدِ نَو کی
نئے الفاظ میں فریاد ہو گی
خلاف اس ظلم کے جو ہو چکا ہے
نئے اسلوب کی ایجاد ہو گی
وہ پیدا ہو گا جو ناپید ہے اب
جسے پڑھ کر طبیعت شاد ہو گی
گلوئے شعر میں جاگے گی تخلیق
ہر اک جانب سے زندہ باد ہو گی
شہادت پائیں گے تو فن کھِلے گا
ہر اک جلسے میں ان کی یاد ہو گی
بندھیں گے نِت نئے بحر و قوافی
مصوّر، نغمہ گر، بُت ساز، گائیک

کریں گے فن سے ظلموں کی تلافی
سیاسی رہ نما منبر پہ چڑھ کر
زبوں حالی کی مانگیں گے معافی
گلا پھاڑیں گے ہمدردی میں ان کی
کہیں گے ووٹ دو، اللہ شافی

۲۱ ستمبر ۱۹۸۹

بند کمرہ

کبھی جو کھولتا ہوں قُفل دھول میں لپٹے
ادھورے خواب، جواں مرگ خواہشیں، جذبے
شکست خوردہ، غم نارسائی کے مارے
جوانیوں کی کھِلی چاندنی کے افسانے
سکوں نواز ہنسی کے ہزارہا فتنے
بغاوتوں کے عَلم کرِم خوردہ، ہنگامے
ہزار شورشیں، عزمِ جہاد ساتھ لیے
کھنکتے قہقہے کم سِن شریر بچّوں کے
خوشی ملال کے غم دیدہ، غم رُبا قصےّ
خموشیوں کی رِدا اوڑھے دیکھتے ہیں مُجھے
انھیں میں مہر بلب، تیری خیر باد بھی ہے
انھیں میں تیرا کرم، بست اور کشاد بھی ہے

۱۳ مارچ ۱۹۹۰

کال چکر

دیکھتے ہی دیکھتے
تیرے اجتناب میں
دِل کے احتساب میں
خاک دھول ہوگئی
سرخوشی، وفا، جفا
سب حلول ہوگئی
ایک آہِ سرد میں
موسموں کی گرد میں
کس کے پاس وقت کا
اس قدر ذخیرہ تھا
بانٹتا رہے مگر
اس کی انتہا نہ ہو
شام ہو سحر نہ ہو
صبح ہو مسا نہ ہو
سب حلول ہو گیا
روشنی میں تیرگی
اور تیرگی بھی گم

قہقہہ بلند سا
اور پھر ہنسی بھی گم
پچھلے باکمال سب
رہ گذر پہ وقت کی
آئے اور کھو گئے
کشتِ درد بو گئے
صبح شام جاگ کر
گہری نیند سو گئے
داستان ہو گئے
فرق اس قدر پڑا
اب ہے یہ زمین گول
پہلے مستطیل تھی
اب گھناؤنی بہت
ان دنوں جمیل تھی
تھی کھلی کھلی بہت
سب ہی کی کفیل تھی

ٹھہرو ہاتھ تھام لو
کچھ نہ کر سکیں مگر
کچھ کیا بھرم رہے
آنکھ چاہے نم رہے
گردنوں میں خم رہے

فیصلہ نہیں ہوا
سانحہ کہ واقعہ
کیا ہے زندگی کا نام؟

کوئی نام دے ہی لیں
بھاگتے خیال کو
جھوٹے اندمال کو
درد کو، وصال کو
ہم نے کچھ کیا کبھی
یہ کہیں رقم رہے
ہونے کا بھرم رہے

دلقِ زیست پر بہت
خون کے نشان ہیں
خوں کیا تھا یا ہوئے
کون مہربان ہیں
کون دشمنِ وفا
کچھ پتہ نہیں چلا!

لاؤ دو ورق مجھے
عمر کی کتاب کے
جن پہ صفحے درج ہوں

صرف دو ورق ملے
جن پہ اتنا ہے لکھا
"ہم نہیں تھے اور ہوئے،
ہم تھے اور نہیں رہے"
جمع ضرب کرکے جو
آئے وہ نکال لو
غم خوشی میں ڈھال لو

۲۴ مارچ ۱۹۹۰

جمالِ ہم نشیں

پرانے پیڑوں کو کاٹ کر ہم
نشست گاہیں سنوارتے ہیں
نئے نئے زندگی کے سادھن
نکالتے ہیں، نکھارتے ہیں
نئی نئی کرسیاں بنا کر
حسین صوفوں کی شکل دے کر
ثقافتوں کو اُبھارتے ہیں
وہ پیڑ کاٹا تھا ہم نے جو کل
جو عشق پیچاں کے پاس اگا تھا
یہ عین ممکن ہے اس کی مسند
پہ، بیٹھنے والے اجنبی دو
اسیر ہو جائیں کیف و کم میں
مہکتی زلفوں کے پیچ و خم میں

یکم اپریل ۱۹۹۰

فصل ۱۰

زمستاں سرد مہری کا، (پس مرگ) اشاعت ۱۹۹۷

ترتیب: سلطانہ ایمان اور بیدار بخت

دیباچہ (آں قدح بشکست): سلطانہ ایمان

اردو اکادمی، دہلی

حرفِ تمنّا

خداوندا! مجھے اُن کی رفاقت دے
جنھیں رہتا ہے پچھتاوا
کہ جیسی زندگی کی اس سے بہتر کیوں نہ کر پائے
مجھے ان کی جسارت دے
جو اپنے نفس کے خادم نہیں ہوتے
برائی کو برائی کہہ کے جیتے ہیں
جو قبروں میں نہیں سوتے
ہوا میں خاک بن کر اُڑ نہیں جاتے
خیالِ روح افزا بَن کے آتے ہیں زمانے میں
شمیمِ جاں فزا بن کر زمیں پر پھیل جاتے ہیں
خدا کہہ کر ہر اک شے پوجتا ہوں جز خدا کے مَیں
مجھے توفیق دے سجدوں کے معنی کچھ سمجھ پاؤں
مرے قرطاس کو ایسی عبارت دے
جو دن پر دن
جلی ہوتی چلی جائے

۸ مارچ ۱۹۹۱

رام راج بجنور میں

دن نے پہرہ اٹھا لیا اپنا
چھوڑ دی راہ شام کی خاطر
رات ایوانِ خاص میں اپنے
ناچے گی اس غلام کی خاطر
جو ہوا و ہوس کا بندہ ہو
پو پھٹے انتظام کی خاطر
صبح کا چوبدار آئے گا
پھر رفاہِ عوام کی خاطر
کچھ کمر بستہ ہو کے نکلیں گے
زر کی خواہش میں دام کی خاطر
جھوٹ کو سچ بنا کے چھوڑیں گے
خواب کار اس نظام کی خاطر
حرفِ آخر ہو آدمی کے لیے
اور بقائے دوام کی خاطر
خاک چھانیں گے کوبکو پھر کے
اور ہم جیسے بے بضاعت لوگ
عزت و جاہ و نام کی خاطر
اک پری چہرہ ہم نفس کے لیے
خواہشِ بے لگام کی خاطر

رام کے عہد میں ہیں یوں زندہ
کاٹتے ہیں کوئی سزا جیسے
زندگی ہے کوئی بلا جیسے
شب کے سناٹے میں،ڈرے، سہمے
بے مددگار و یارِ بے دمساز
سنتے ہیں رائفل کے کندوں سے
در و دیوار توڑتی آواز
شہر بجنور کے گلی کوچے
دم بخود ہیں، خدا یہ کیا ہے راز
گولیوں، گالیوں سے پُر ہے فضا
محتسب بن گیا ہے سانحہ ساز
راز داری ہے ایک ہر جانب
گرم جھونکا ہوا کا ہے غماز
طاقتیں سلب ہوگئیں ساری
اور قانون کا پرِ پرواز
کٹ کے دو لخت ہوگیا جیسے
کس سے پوچھیں کہ کیا ہے اس کا جواز
"موت کا ایک دن معیّن ہے"
رام لیلا ہو تیری عمر دراز
فوج کے سب حفاظتی دستے
کل تلک تھے جو صرف دوست نواز
غیر نکلے، بدل گئیں شکلیں

الٹی کر دی تمام ہی تگ و تاز
عورتوں، چھوٹے چھوٹے بچوں پر
ایسے جھپٹے، شکار پر کوئی باز
اور گنگا کا پانی، پاک، پوتر
رِشیوں، مُنیوں کے لمس کا ہمراز
منتظر ہے کہ ان اسیروں کو
اک عقیدت سے،صدق دِل کے ساتھ
شدھ پانی میں غرق کر جائیں
سرخرُو ہو کے اپنے گھر جائیں

۷ اگست ۱۹۹۱

صریرِ خامہ

کچھ قلم لے کے گھاس کھودتے ہیں
اور کچھ گھاس کو قلم کے لیے
شکل دیتے ہیں ایسے سادھن کی
جس پہ تسکینِ چشمِ نم کے لیے
خالقِ شش جہت کا اک بندہ
ایسی تحریر ثبت کرتا ہے
جس میں پروردگار رہتا ہے

۱۲ اگست ۱۹۹۱

مُداوا

دِلِ درماں طلب کہتا ہے، جنگل دِل کا درماں ہے
کہیں دریا کنارے پھونس لا کر جھونپڑا ڈالو
تمھیں سورج کی کرنیں جب اُٹھانے آئیں، اُٹھ جاوٗ
اندھیرا شام کا پھیلے تو شب خوابی میں کھو جاوٗ
وہاں پھَل پھُول جو مِلتے ہیں، توڑو، صبر سے کھا لو
نہادِ زیست اس دُنیا سے ہٹ کر اک نئی ڈالو
ستارے، چاند، اُن کی روشنی جینے کو کافی ہے
عطا فطرت کی ہے تازہ ہوا جنگل کی، شافی ہے
ہلاکت کی طرف ہے گام زن دِن رات یہ دُنیا
کِیا ہے آدمی نے عمر بھر نقصان کا سودا
مشامِ جاں کو جو تازہ کرے وہ گُل نہیں کھِلتا
شمیمِ جاں فزا کا ایک جھونکا بھی نہیں مِلتا

۱۶ اگست ۱۹۹۱

زمستاں سرد مہری کا

کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
کسے آواز دو گے، رنگِ پیراہن تصوّر میں
بہت جلوہ گری کرتا ہے، لیکن وہ قد و قامت
تکلّم کا کرشمہ سا تو اوجھل ہے نگاہوں سے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہی نہیں کوئی
بجز اس کے اُٹھا لائیں وہ جنّت سی تخیّل میں
چمن سازی کریں
لفظوں کے گُل بوٹے کھِلائیں، اس کے دامن کو
کچھ اس انداز سے کھینچیں، وہ ٹھٹھا مار کے ہنس دے
خفا بھی ہو
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہے
گزرتی رات کی چاندی پگھلنے دیں
یہ گھاؤ صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
بہت اُڑتے ہوئے رنگوں کی جھینی چھلنی چادر سے
مرے ہونٹوں سے لپٹی ناطلب بوسوں کی شیرینی
وہ سب آئینہ خانوں میں سجی تصویر سے چہرے
محرّک فلم کے پردے پہ عیشِ بزم کے ساماں
وہ سارے ہم نوالہ، ہم پیالہ یوسفِ ثانی

دلِ درد آشنا لے کر جو اِس دنیا میں آئے تھے
مری یادوں کے البم میں ہیں ان کی دھندلی تصویریں
شکست و کامیابی کے مناظر، خندہ پیشانی
شہابی گالوں پہ موتی کی لڑیاں ٹوٹتی بنتی
وفا کی داستاں، رُسوائی کے قصے
یہ کس کس کی ہنسی، سرگوشیاں، باتیں ہیں، سب پہچانتا ہوں میں
میں کیسی آشنائی سے پکڑتا ہوں کلائی کو
وہ کیسی دِلربائی سے چھڑا لیتی ہے ہاتھ اپنا
وہ منہ کا ذائقہ، باتوں کی گرمی، رات کا جادو
بہے جاتی ہے میری کشتیِ عمر رواں کیسے
حواسِ خمسہ، سحر سامری میں، وقت کی گم ہیں
فسانہ تھا جہاں جیسے، حقیقت تھی گماں جیسے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
بہے جاتی ہے میری کشتیِ عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوتا جا رہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

۱۷ اگست ۱۹۹۱

نقلِ مکاں

کلی کھِلی تھی اِسی واسطے کہ پھول بنے
مہکتے پھول کو تم سے مشابہت دے دوں
تمھاری چاہ میرے کتنے کام آئی ہے
تمھارے قرب کی ضد ہے، موانست دے دوں
فضائے دہر کے بگڑے ہوئے مزاج کو میں
سکون چاہتی تھیں ساری مضطرب روحیں
مگر وہ دستِ شفا، سب کی احتیاج کو میں
سکون دے دوں، میری دسترس سے باہر ہے
کوئی وسیلہ نہیں میرے پاس درماں کا
یہ التجا ہے خُدا سے توجّہ فرمائے
فلک سنبھال چُکا، اب زمیں پہ آ جائے

۱۸ اگست ۱۹۹۱

نروان

حواس بھی مجتمع ہوں سارے
دماغ بھی جاگتا ہو دِل بھی
تمام سبتک کے سُر ملا کر
مراقبہ میں ہو روح گِل بھی
کدورتیں ساری دھو کے اپنی
سکوں طلب جانِ مضمحل بھی
عظیم پیکر سا بن گئی ہو
جو تلملاتی، کراہتی ہو
جو لمحہ لمحہ یہ چاہتی ہو
کوئی ہٹادے نگاہ کے سامنے سے پردے
کوئی اچانک حیات کے بھید کھول ڈالے

۱۷ دسمبر ۱۹۹۱

گرم ہوا

ہر طرف چل رہی ہے ایسی ہوا
زندگی کی پڑی ہوئی مدقوق
لطف و مہر و وفا کا قحط پڑا
کوئی عاشق رہا، نہ اب معشوق
شعر و نغمہ خیال و خواب ہوئے
دافعِ درد ہے فقط بندوق
رام بھی نیم جاں، خُدا بھی نزار
کیسا نِکلا ہے اشرف المخلوق

۱۸ مئی ۱۹۹۲

سترّویں سالگرہ

میں ہر آن، ہر لمحہ مرتا رہا ہوں
جسے میں نے بالیدگی سے عبارت کیا ہے
بہت رنگ کی تتلیوں، طائروں کی کہانی
دھڑکتے ہوئے دِل، جواں خون کی سرگرانی
لمس کی، آنچلوں کی، حرارت کی باتیں
رت جگے، خلوتیں، گرمیِ شوق، راتیں
تند ترے سے اک بوسۂ بے محابا
جواں، گرم آغوش، آنکھوں کا بہتا دوآبا
یہ سب کشتِ افسوس بوتے رہے ہیں
یہ سب میری تعمیر میں دفن ہوتے رہے ہیں
ہمیشہ سے میرا وطیرہ رہا ہے
چیز کم ہونے کو چیز بڑھنا کہا ہے

۴ جون ۱۹۹۲

باز گشت

نہ کوئی چہرہ شناسا، نہ کوئی راحتِ جاں
چلے کہاں کے لیے تھے، ہم آگئے ہیں کہاں
وفا کی راہ میں ہر سمت خاک اڑتی ہے
نہ دُور تک کہیں چھاؤں،نہ راستوں کے نشاں
وفا بھی سوختہ لب اور جفا بھی سوختہ لب
نہ قہقہے ہیں فضا میں کہیں، نہ آہ و فغاں
یہ کس کا عہدِ ستم ہے، ذرا پتہ تو چلے
ہزار چہرے ہیں، ہر شخص کا ہے حکم رواں

فراعنہ ہیں، نہ شدّاد ہے، نہ کنس کوئی
مگر انھیں کی صدا سے بھرے ہیں کون و مکاں
۱۰ جولائی ۱۹۹۲

شب و روز

زندگی طفل ہے کم فہم سا، کم مایہ سا
راہ پر وقت کی کشکولِ گدایانہ لیے
بیٹھا رہتا ہے ، صدا دیتا ہے اور ڈھونڈتا ہے
اُس خداوند کو، اس والیِ نعمت کو جسے
رحم آجائے تو کشکول بھرے موتیوں سے
اور ہوس، طفلِ پری چہرہ کو بہلاتی ہے
پیار سے چومتی ہے، بھینچتی، اکساتی ہے
بیسوا کی طرح ہنستی ہے، کبھی روتی ہے
مطمئن ہوتی نہیں کتنا ہی مِل جائے اسے
جہل خوش باش مسافر ہے، مِلے کچھ نہ مِلے
اپنے خرقہ میں لگاتا نہیں پیوند کوئی
گر کوئی پوچھے کہاں جانا ہے، ہنس دیتا ہے
راہ میں تیرتھ ہیں، سنگم ہیں، عبادت گاہیں
اس جگہ آن کے مِل جاتی ہیں ساری راہیں
معتقد بولتے ہیں چینی میں، عبرانی میں
فارسی، ہندی میں، عربی، کبھی لاطینی میں
سب کی سنتا ہے خدا، آگے بڑھا دیتا ہے
"جاؤ دیکھو ہے وہاں آگے تمہارے لیے کیا
یونہی چلتے رہو، مت چھوڑنا یہ راہِ وفا"

اور جنّت کی طلب سوُرگ کے سپنے لے کر
زشت خو، اہلِ ہوس، آگے بڑھے جاتے ہیں
اور تھک جاتے ہیں پھر نیند سی آجاتی ہے

۱۲ ستمبر ۱۹۹۲ء

زیاں کار

زیاں کاری ہمارا جیسے اک آبائی پیشہ ہے
بہت اُڑتے پھرے، تھگلی لگائی آسماں میں
بہت فتنے جگائے، زہر بویا ارضی جاں میں
بہت سمجھا کیے دانشوری کو ایسا تیشہ ہے
ہمالہ کاٹ کر صحراؤں میں دریا بہا دیں گے
پہاڑوں، وادیوں، گھر بستیوں میں نُور بھر جائے
ہر اک گوشہ، ہر اک منظر اجالوں سے نکھر جائے
ہم ایسے لاف زن لفظوں کے گل بوٹے کھلاتے ہیں
خزاں گل پوش کرتے ہیں، بہاروں کو رجھاتے ہیں
زمیں رُک جاتی، جوہر نطق کا کچھ ایسا کر پاتا
کبھی ایسا نہ کر پائے کہ جاتا دن ٹھہر جاتا
گریزاں بھاگتے پَل اپنی مُٹھی میں پکڑ لیتے
جوانی کا شگفتہ جسم بانہوں میں جکڑ لیتے
ہمارے حکم سے بس ایک پَل دَم بھر کو رک جاتا
عروسِ شام کے چہرے کا غازہ ہی ٹھہر جاتا

۹ اکتوبر ۱۹۹۲

عزم

غنودہ ریل کا اڈہ ہے سُونا
ابھی اُٹھ جائے گا، آئے گی گاڑی
ابھی چشمِ زدن میں بھیڑ ہو گی
مراٹھا، کوئی گجراتی، پہاڑی
سیامی، بنگلہ دیشی یا کوئی اور
کوئی چالاک، سادہ، کچھ لپاڑی
وہ اک بچّہ چلا آتا ہے بھاگا
سراسیما سا، کچھ کھویا ہوا سا، کچھ اناڑی
کہاں سے آ گیا، جانا کہاں ہے
کوئی ہے ساتھ، آگے نہ پچھاڑی
شناسا، آشنا، کوئی خداوند
ٹھکانہ، کچھ پتہ، گھر، کھیت، باڑی
کہیں بھی کچھ نہیں، بس چل پڑا ہے
سفر ہے اس کی منزل، اور کیا ہے
لیے ہے دِل میں کچھ کرنے کی خواہش
کہیں پہنچے گا، اس کا بھی خدا ہے

۱۲ اپریل ۱۹۹۳

پس منظر، پیش منظر

ریل کی سیٹی، گھنا جنگل، دھواں اٹھتا ہوا
کچے پکے جھونپڑے، دن ڈوبتا، بچوں کا شور
دھول میں لپٹے شجر، سرخم کیے اک بوجھ سے
شام کی دلہن سجاتی، اک تھکی ماندی سی بھور
شب گزاری کو چراگہہ سے پلٹتے قافلے
بے زبانوں کے، کہیں پیڑوں میں بیٹھا ایک مور
کوکتا ہے جیسے رخصت کر رہا ہے شام کو
گلہ بانوں کے تھکے چہرے، کھنکتی ٹالیاں
گردنوں میں ڈونگروں کے، سر پہ پھیلا آسماں
سوگ میں ڈوبا ہوا بن، جھینگروں کی راگنی
بھاگتی پگڈنڈیوں کو سُونا پن دیتی ہوئی
بڑھتے سناٹے میں گم ہوتی ہوئی رہرو کی چاپ
دوٗر سے آتی ہوئی، جاتے پرندے کی الاپ
ایسے پس منظر کو اوڑھے چل رہی ہے زندگی
ڈگمگاتی، رُکتی، بڑھتی، گاہ ستاتی ہوئی
گڑگڑاتی پیش منظر میں ہیں برقی گاڑیاں
موٹروں کا شور، ان کے تیل سے اٹھتا دھواں
ایک تعمیروں کا جنگل، قمقموں کی روشنی
عشرت آبادوں میں دنیا ناچتی، گاتی ہوئی

سر پہ طیارے ہوا میں راستے کھیتے ہوئے
شہر کی گنجان آبادی کو زہریلی فضا دیتے ہوئے
اور شہر آرزو کا بے ریا، مسکین شخص
میں ، مقید خود فریبی، وسوسوں کے جال میں
اپنی خوشیاں ڈھونڈتا، وحشت زدہ اس حال میں
سوچتا ہوں میں نے کیا چاہا تھا خود سے کیا مِلا
اس کد و کاوش میں پیراہن ہی میلا ہوگیا
آج اور کل کے میاں جو ساعتیں تھیں دِل نشیں
راہ کی بھگدڑ میں سب اللہ جانے کیا ہوئیں
سگ نوازی کے چلن میں سوکھ کر فصلِ مراد
ایک کانٹا بن گئی ہے، سگ نوازی زندہ باد

۱۱ اپریل ۱۹۹۳

کاوش

نیا دن روز مجھ کو کتنا پیچھے پھینک دیتا ہے
یہ آج اندازہ ہوتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ
ہزاروں میل کی دوری پہ تم سے آ گیا اور اب
دِنوں، سالوں، مہینوں کو اکٹھا کر کے گُم گشتہ
دیارِ ہُو میں بیٹھا ہوں، نہ کچھ آگے نہ کچھ پیچھے
سِوا کچھ وسوسوں کے، کچھ خساروں کے، کمر بستہ
کہیں چلنے کو آگے جس کا واضح کچھ تصوّر ہی نہیں کوئی
ہمارے سب مسائل جن کا ہم پر بوجھ ہے اتنا
ہماری کشتِ بے مایہ ہیں، اس صحرا میں کیا بویا
بگولوں کے سِوا، کچھ گرم جھونکوں کے سِوا ہم نے؟
چلو اک تیز دھارے میں کہیں پر ڈال دیں کشتی
لطافت ٹھنڈے پانی کی کریں محسوس کچھ، تھوڑا بکھر جائیں
ہنسیں بے وجہ یونہی، غُل مچائیں، بے سبب دوڑیں
اُڑیں اُن بادلوں کے پیچھے اور میلوں نکل جائیں

۱۳ اپریل ۱۹۹۳

بچھڑا ہوا آدمی

کبھی کبھی درِ دِل پر صدائیں دیتا ہے
وہ ایک خواب نُما شخص دھول میں لپٹا
جو میرے ساتھ رہا ہر قدم پہ سالہا سال
سب اس کے بال، بھویں، چہرہ مہرہ، وہ نقشا
جو میرے ذہن میں تھا کتنا مختلف ہے آج
نہ اجتہاد کا جذبہ، نہ بجلیوں کا مزاج
نہ اشتیاق وہ آنکھوں میں، گفتگو میں جلال
غنا میں ڈوبی ہنسی کی لطیف سی آواز
اُبھرتا ڈُوبتا، ہونٹوں پہ ایک تشنہ سوال
کہاں گیا وہ خداوند، اس کی عمر دراز

جنوری ۱۹۹۴

نجات

اک آندھی آئے گی اور شہر کے سب قمقمے بجھ جائیں گے اک دم
تلاطم تیرگی کا ڈھانپ لے گا بام و در، پہنائیِ عالم
اچانک تیرگی میں اک کرن سی جگمگائے گی
مسیحا آسماں سے آئیں گے، اک روشنی سی پھیل جائے گی
زمیں پر ہر طرف، اور روشنی میں دُور اک تنہا
بہت ہی مُضطرب سا اک جواں یوں منتظر ہو گا
کہ جیسے آج ہی کے دن کی خاطر وہ رہا زندا
بڑھے گا وہ مسیحا کی طرف بے تاب ہو کر، روک دیں گے وہ
وہیں ٹھہرو مجھے معلوم ہے، کیا چاہیے تم کو
تمھیں چھو کر تمھارے سب مَرَض میں دُور کر دوں گا
مری زنبیل میں ایسا کوئی نسخہ نہیں لیکن
تمھیں دے جاؤں اور تم فکر سے آزاد ہو جاؤ

۲۶ فروری ۱۹۹۴

ذکرِ مغفور

نیند جب آئے گی احساس کے دروازے پر
کوئی آواز نہیں دے گا، مودّب خدام
اہلِ خانہ کی سراسیمگی پر چونکیں گے
اور پہلو سے لگے بیٹھے کمر بستہ غلام
دُور بیں آنکھیں، دلِ زندہ، محافظ بازو
جب یہ دیکھیں گے کہ تدبیر ہوئی ہے ناکام
چھوڑ جائیں گے اسے درد سے لڑنے کے لیے
لوگ مٹی کو اُٹھا کر کہیں باہر گھر سے
لے کے جب جائیں گے، مچ جائے گا ہر سُو کہرام
جھانکتی آنکھیں نظر آئیں گی دروازوں میں
کچھ تاثر نہیں رہ جائے گا آوازوں میں
پھر کبھی وقت ٹہلتا ہوا آئے گا وہاں
اور دیکھے گا کہ سب باغ کے گملے ہیں نئے
ڈھیر سے پھول نئے آ گئے باغیچے میں
سارے پیڑوں پہ نئے پھول، نئی پتیاں اُگ آئی ہیں
اور پیڑوں پہ پھدکتے ہوئے خوش رنگ بئے
اُڑتے پھرتے ہیں ہر اک شاخ پہ چہلیں کرتے
گھونسلے بُنتے ہیں شاخوں میں غزل گا گا کر
جھوم کر داد سی دیتے ہیں مگن ہو کے شجر

گھر کے اندر سے کھنکتی سی ہنسی کی آواز
بہتے بہتے کھلے آنگن میں نکل آئی ہے

۳ مارچ ۱۹۹۴

تشخیص

مجھے یہ کون سے دارالشفا میں لائے ہو
یہاں تو بھیڑ ہے اک زرگزیدہ لوگوں کی
جو اپنے زخم کے مرہم کی جستجو میں ہیں
علاج اس کا تو ممکن نہیں زمیں پہ ابھی
یہ زرگزیدگی ایسا مرض ہے جس کے سبب
بہت سے اور مرض جسم میں اُبھرتے ہیں
ہر ایک موڑ پہ، راہوں میں کتنے جاں بلب
پڑے کراہتے ہیں لادوائی کے ہاتھوں
بشر گزیدہ ہوں میں لے چلو یہاں سے مجھے
مرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

۱۲ مارچ ۱۹۹۴

ماضی استمراری

ہم جہانگیر، جہاں دار تھے کب
خسروِ عصر، بڑے اہلِ سبب
آسماں اوڑھا، زمیں کا بستر
پھیلا رہنے دیا اوروں کے لیے
سانس تو لیتے رہے، یاد نہیں کیسے جیے
دیکھنا اب جو مری خاک پلٹ کر آئے
اور کسی طرح مرے جینے کا سامان بنے
جس طرح پہلے کیا، ویسے ہی کرنا لوگو
اپنے دروازے کبھی کھولنا مت میرے لیے

۱۶ اپریل ۱۹۹۵

پشیمانی

وہ ساعت جب دُرِ مقصود آتے آتے ہاتھوں میں
کہیں پر رہ گیا، دِل کو بڑے انداز سے چشمِ فسوں گر نے
دیا اذنِ محبّت، ہم نے پھیلایا تہی دامن
ہمارے ذہن کے اندر کہیں بیٹھے ہوئے موہوم سے ڈر نے
قدم یوں ڈگمگائے چھٹ گیا ہاتھوں سے ہر قدغن
وہ ساعت کھو گئی، اب دِل میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے
نہ یوں ہوتا تو یوں ہوتا، وہ ہو جاتا تو کیا ہوتا

خدا

وہاں نہیں ہے، اسے تم جہاں سمجھتے ہو
کہاں ہے، یہ بھی نہیں جانتا کوئی ویسے
کہاں نہیں ہے، بتانا تو یہ بھی مشکل ہے
اسی نے مٹی سے میرا وجود گوندا ہے
مجھے قلم سے سکھایا ہے علم، اس نے ہی
مجھے جگاتا ہے وہ صبح دمِ صبا بن کر
اندھیری رات میں آجاتا ہے ضیا بن کر
میں اس کو چھوڑ کے بھاگا ہوں بارہا، ورنہ
پکارتا ہوں تو بالکل قریب مِلتا ہے
نسیمِ صبح سے جب پھول پھول کِھلتا ہے
وہ کیاریوں میں ہوا بَن کے سرسراتا ہے
طرح طرح کے پرندوں کی بولیوں میں کبھی
گھنے درختوں کے پیچھے مجھے بلاتا ہے
غروبِ شام کی دھندلی سی روشنی میں کبھی
مرے گمان کی حد سے ابھارتا ہے مجھے
وہ ایک غولِ بیاباں سا روشنی کا کہیں
اُبھرتے پودوں کو، فصلوں کو روح دیتا ہے
لدے پھلوں سے درختوں میں رَس بناتا ہے
لہو کی طرح مرے جسم میں مچلتا ہے

مٹھاس بن کر مرے ذائقے میں آتا ہے
زمیں پہ چشمے بہاتا ہے، پیاسی مٹی کو
حیات دیتا ہے، گلزار سے کھلاتا ہے
زمیں کے خطوں پہ اُڑتا، پھلانگتا جیسے
قدم قدم پہ مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
احاطہ کرتا ہوں اس کا خیال سے جب میں
مگر وہ صدیوں کی وسعت پہ پھیل جاتا ہے
وہ میری ذات میں ہے اور پہنچ سے باہر بھی
وہ کائنات بھی ہے اور میرے اندر بھی

واحد غائب

جیسے ہر شے سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا ہے
تم ہو اور نہیں ہو ، چہرہ مہرہ اور تبسّم
سب ماضی جیسا ہے، ساری باتیں اور تکلّم
ویسا ہی ہے، جب ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے
یوں ہی بے مقصد ہنستے تھے ، مبہم خوابوں سے ڈرتے تھے
جب تھیں تم سر تا پا چاند کا اک ہالا سا
اور میں جیسے چاکِ گریباں متوالا سا
جب موجیں ہی موجیں تھیں پتہ نہیں تھا کچھ ساحل کا
جب میں آنکھوں میں ڈھونڈا کرتا تھا حل مستقبل کا
اور تم بات بدل کر دھیان بٹا دیتی تھیں
معنی خیز ہنسی سے میرے اندر آگ لگا دیتی تھیں
میں بھی وہی نہیں ہوں اور دُوری کے ایک خلا نے
ہم دونوں کو ایسے جسموں میں بدل دیا ہے
جن کے آگے پیچھے وہی نہیں جیسا جب تھا
میں نے چاہا تھا تم تعبیر بنو میرے خوابوں کی
تم نے بھی کچھ ایسا ہی یا مِلتا جلتا سوچا ہوگا
ہم کتنی دور نکل آئے ہیں، تم اور میں آج وہی ہیں
مگر نہیں ہیں، آنکھوں میں حلقے ہیں آج تمھاری
جو نادیدہ آلام کی غمازی کرتے ہیں

خالی سا لفظ نظر آتا ہے وہ شوقِ دلداری
میرا بھی ہنسنے کی کوشش میں چہرہ بدل گیا ہے
لیکن اب سمجھوتا کرکے دِل کچھ تھوڑا سنبھل گیا ہے
باقی حالات وہی ہیں، ویسا ہی ہے جیسا جب تھا
گھر کی چھت میں اب تک چڑیا انڈے دیتی ہے
اس کے بچوں کی "چرچر" سے گھر میں رونق رہتی ہے
بارش کھلتی ہے تو کوّے پر پھیلا کر دھوپ میں بیٹھے
سورج غسل کیا کرتے ہیں، پیڑ پر بیٹھے بندر کے بچّے
قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں، باغوں میں مور پپیہے
کتنے ہی پنچھی ، بلبل ، کوئل اور ممولے
ہنگامہ برپا رکھتے ہیں، آتے جاتے ہر موسم میں
لیکن تُم گو تُم ہو مگر نہیں ہو، اور بھی کچھ ہو
میں بھی اور ہی کچھ ہوں گزرے وقت کے اس حلقے میں
تم کو میں اور مجھ کو تم مضطر ہوکر ڈھونڈ رہی ہو

خلا

خلا کیوں پُر نہیں ہوتا
پرندوں کے ہزاروں رنگ
آموں سے بھری ڈالی
لسوڑوں کے ہرے خوشے
لٹکتی جامنیں کالی
میں بھولا تو نہیں پھر کیوں
مسلسل کرب رہتا ہے
خلا کیوں پُر نہیں ہوتا

گرگٹ

آبرو باختہ عورت کی طرح
ہر ضرورت میری اکساتی ہے
روز لے جاتی ہے نیلام گھروں میں مجھ کو
اور مرے کان میں آہستہ سے فرماتی ہے
تلملانے سے مسائل نہیں حل ہوتے کبھی
ایسا اک چہرہ کسی طرح سے ایجاد کرو
دیکھ کر موقع محل رنگ بدل لے اپنا

نیاز

قرآں کی آیتوں کے ساتھ ارواحِ اب و جد کو
خمیری روٹیوں اور قورمے کے ساتھ رخصت کردیا ہم نے
خدا بھی خوش ہوا ہوگا کہ زیبائے جہاں خوش ہیں
عمل سے اپنے منہ کھولے تھا دوزخ، بھر دیا ہم نے

نظم نمبر ۱

دیکھتے دیکھتے افسانہ بنی ہے دنیا
دیکھتے دیکھتے سب رنگ فضا میں بکھرے
اتنی تصویریں بنیں دِل کو لبھانے والی
کہکشاں بن کے، شفق بن کے مناظر نکھرے
دیکھتے دیکھتے دِل جوئی کا سامان ہوا
قہقہے، گرمیِ الفاظ، جواں سی آغوش
دیکھتے دیکھتے اس بات کا ارمان ہوا
وہ ہمیں چاہے، ہم اس بُت کو بنائیں اپنا
دیکھتے دیکھتے گل رنگ ہوئی بزمِ حیات
دیکھتے دیکھتے بے مہر ہوئے مہر تمام
دیکھتے دیکھتے بے مہر خدا کی بستی
غل غپاڑہ بنی، پھر پاؤں کی زنجیر بنی
ڈھیرے سے رنگ سمٹ کر بنے اک شخص کی ذات
اور پھر خواب بنا، خواب کی تعبیر بنی
میں بگولہ سا بنا، جھونکا ہوا کا ٹھنڈا
وہ سبک رنگوں کی ہنستی ہوئی تصویر بنی
دیکھتے دیکھتے عالم ہوا اک خواب و خیال
دیکھتے دیکھتے ہم بن گئے اک تشنہ سوال

نظم نمبر ۲

کون بُنتا ہے شب و روز کا تانا بانا
کون دوڑاتا ہے دن رات کو آگے پیچھے
کون دیتا ہے توانائی کہ ہر برگِ شجر
پیرہن پھاڑ کے پت جھڑ کے عدم سے جاگے
میں بصیرت ہی کو روتا رہا، کم بینوں نے
بقعۂ نُور بنا ڈالیں اندھیری راتیں
کوئی آئے گا سر کوہ، تجلّی لے کر
میں اسی وہم میں بیٹھا رہا، قاتل سارے
آگئے منچ پہ نادیدہ تماشا لے کر
میں نے سوچا تھا کہ آلام سے فرصت جو مِلے
چین سے بیٹھوں گا، اور جائزہ لوں گا اپنا
ذہن بے مہری ایّام سے غافل ہوکر
جاگتی آنکھوں کو دکھلائے گا کوئی سپنا
اب مگر کچھ بھی نہیں صرف یہ احساس کہ مَیں
ایسا ناداں تھا بھروسا کیا ہر لمحے پر
جو مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آیا تھا

نظم نمبر ۳

تمھارا جسم، آنکھیں، کھنکھناہٹ قہقہوں کی
لبِ لعلیں سے گل باری، ترنم گفتگو کا، لمس کا جادو
پریشاں گیسوؤں کو ایسے سلجھانا، بکھر جائیں
بکھر کر ہر طرف پھیلائیں ایسی روح زا خوشبو
حواسِ خمسہ بے قابو ہوں، ساری کائناتِ دِل
ہوا میں منتشر ہو جیسے بوئے گل، رمِ آہو
زمانہ کل جو آئے گا نہ تم ہوگی، نہ میں ہوں گا
مگر یہ کرب جو لمحات کا ہم نے ابھی دیکھا، ابھی جانا
یہ سب زندہ ہے، پائندہ ہے، یوں لگتا ہے افسانہ

۲۸ نومبر ۱۹۹۳

نظم نمبر ۸

آتی ہے نظر وقت کی بدلی ہوئی صورت
رکھتا ہے مرے سامنے آئینہ ایام
کچھ رنگ تو باقی ہیں مگر پڑ گئے پھیکے
آنکھیں جو کبھی ہوتی تھیں مستی سے بھرا جام
دھندلا گئیں اور دور کہیں، دور خلا میں
کچھ ڈھونڈتی ہیں یاد نہیں آتا مگر نام
نقاش کے سب نقش بگڑنے سے لگے ہیں
چہرہ جو کبھی صبح تھا، اب لگنے لگا شام
کچھ اور جو گلفام تھے ہمراہ، بکھر کر
کیا ہوگئے سب، کوئی نہ نامہ ہے نہ پیغام
یہ کوئی ہمیں توڑتا، گڑھتا ہے کہ یونہی
ہم سوچتے ہیں، بات کا آغاز نہ انجام
پیچھے کوئی بیٹھا ہے کہ ہم جس کی ہیں تحریر
یا حرف غلط ساختہ، پروردۂ اوہام
فطرت کے کسی حادثے نے شکل بنادی
اور چھوڑ دیا کہہ کے بنا اپنے در و بام
اب ساخت کیا کرتے ہیں دن رات ہیولے
جینے کے لیے راستے کرنے کا کوئی کام

دن رات کی نادیدہ کٹھالی میں پگھل کر
جو بنتا ہے وہ سارا مرکّب ہے بہت خام
وہ کون سا مقصد ہے جسے پورا کروں میں
گڑھتا رہوں کب تک نئے سادھن، نئے اصنام

نظم نمبر ۵

مرے نگراں فرشتے مجھ کو تجھ سے کچھ شکایت ہے، نہ شکوہ ہے
مرے دِل نے مجھے راہِ طلب کہہ کر چلایا ایسی راہوں پر
جو نامانوس تھیں اور مجھ کو رغبت بھی نہ تھی ان سے
جہاں عفریت کے سائے تھے ساری شب پناہوں پر
یونہی چلتے ہوئے اِس وادیِ "ہیہات" میں کوسوں نکل آیا
مگر مڑ کر جو دیکھا اک پشیمانی کی کھیتی ہے، نگاہوں پر
یقیں آیا نہیں یہ فصل میں نے بوئی ہے، اب کون کاٹے گا
یہ میری آخرت یا آ۔نے والوں کا مقدر ہے، گناہوں پر
جو سرزد ہوگئے مجھ سے، انھیں اب کون بھوگے گا

نظم نمبر ۶

تمہارے جدّ و امجد اب کہاں ہیں، کہہ نہیں سکتا
کہیں اطراف میں، جنت میں، یا قعر جہنّم میں
زمیں کو تم نے اُن کی یاد میں پامال کر ڈالا
ستم جو کر رہے ہو تم اب اُن کے درد میں، غم میں
اگر وہ اُن کی رسمیں یا عقیدے زندہ ہوجائیں
تو سوچو کیا پلٹ آئے گا، ساری بربریت بھی
غلامی، جہل بھی، ساری سزائیں اور اذیّت بھی
یہاں آرام سے تم بھی رہو، اُن کو بھی سونے دو
جہاں وہ ہیں، زمیں کو ایسے مت روندو
زمیں جو سب کا مامن ، آخری آرام گہہ بھی ہے
زمیں جوتو، نئی فصلیں اگاؤ، کھیتیاں کاٹو
بزرگوں نے دیا جو وہ بھی رکھو، جہل مت بانٹو
گزر جاؤ جہاں سے بوئے گل، تسکینِ جاں بن کر
لنگوٹی کھل گئی تو دُم نظر آئے گی ماضی کی کتھا بن کر

نظم نمبر ۷

کیسے آہستہ آہستہ دن بیت رہا ہے
دن کوئی بیمار نہیں جو بستر سے اٹھ کر
انگڑائی لے گا اور کہے گا، اب میں پہلے سے بہتر ہوں
دن تو باب ہے پچھلے منظر نامے کا جب مَیں نے
اک تصویر میں تھوڑے رنگ بھرے تھے جو اچھے لگتے تھے
دن تو زلفوں کے بَل میں اُلجھا ایک فسانہ ہے جیسے
اور اس افسانے کو میں نے لکھا تھا خونِ دِل سے
دن تو میری ناکامی کا رونا، شادی کی شہنائی ہے جیسے
اس دن کے سارے رنگ بدلتے رہتے ہیں اکثر
اس کے کتنے نام ہیں، کتنے چہرے ہیں، کتنے رُخ ہیں
میں کچھ خواب لیے پھرتا رہتا تھا بستی، بَن، جنگل میں
دن بھی میرے ساتھ تھا شامل تنہائی کی اس منزل میں
سربرآوردہ لوگوں کی باتیں سننے ہر محفل میں جاتے تھے
فرش پہ بکھرے گوہر چننے، ہر محفل میں جاتے تھے
ہم نے بَن جنگل تسخیر کیے، صحرا میں جھنڈے گاڑے
ہم نے اپنی باتوں سے بڑے بڑے مردِ میدان پچھاڑے
کیسے آہستہ آہستہ دن بیت رہا ہے
لیکن تب اس کی یہ چال نہیں، رفتار نہیں تھی
تب یہ ہاتھ میں نیزہ لے کر، گھوڑے پر چڑھ کر آیا تھا

تب یہ ننگی تلوار لیے میلوں آگے بڑھ کر آیا تھا
اب ہم نے سب نیزوں، تلواروں کو توڑ دیا ہے
اب ہم نے گوہر چننا، سر بر آوردہ لوگوں کو چھوڑدیا ہے
وہ سب اپنے لفظوں کی قبروں میں دبے ہوئے ہیں
ہم بھی کچھ بے معنی باتیں، قصّے لے کر بیٹھے ہیں
بلبل کی آواز یہاں کتنی اچّھی اور سہانی لگتی ہے
اس کا بیتے موسم، زخموں کے رِسنے سے کوئی ناتا رشتہ
کوئی تعلق، سلسلہ، کچھ بھی نہیں ....

ایک نظم کے مختلف مسوّدے

مسودہ ۱ (ایک نظم)

میں صدق دِل سے تیری ذات کے ہونے کا قائل ہوں
مرا ایمان ہے تیرے فرشتوں پر، رسولوں پر
کتابوں پر جو وقفے وقفے سے آتی رہیں اُن پر

مسودہ ۲ (ایک نظم)

میں صدق دِل سے تیری ذات کے ہونے کا قائل ہوں
مرا ایمان ہے تیرے فرشتوں پر، رسولوں پر
کتابوں پر، ہدایت کے لیے بھیجی ہیں جو تو نے
جزائے خیر و شر پر، حشر پر، جس دن اُٹھوں گا میں
ردائے خاک اوڑھے اس زمیں کی آخری تہہ سے
یہ زیرِ ناف گھونسہ مارنے کی کیا ضرورت تھی
یہ شیطاں کیوں کھڑا ہے راہ روکے، تخلیق کے دن سے

مسودہ ۳ (بلا عنوان)

میں تیری ذات کے ہونے کا قائل ہوں
مرا ایمان ہے تیرے فرشتوں پر
رسولوں پر ہدایت کے لیے بھیجے ہیں جو تو نے
میں صدق دِل سے تیری ذات کے ہونے کا قائل ہوں
مرا ایمان ہے تیرے فرشتوں پر، رسولوں پر
تری اقلیم کے سارے اصولوں پر
کتابوں پر ہدایت کے لیے بھیجی ہیں جو تو نے
جزائے خیر و شر پر، حشر پر، جس دن میں اٹھوں گا
ردائے خاک اوڑھے اس زمیں کی آخری تہہ سے

مسودہ ۴ (حمد)

میں صدق دِل سے تیری ذات کے ہونے کا قائل ہوں
مرا ایمان ہے تیرے فرشتوں پر، رسولوں پر
تری اقلیم کے سارے اصولوں پر
ہوا میں گیت گاتے خوش نما رنگیں پرندوں پر
بھنور کی بات سُن کر کھلکھلاتے ہنستے پھولوں پر
نگارِ صبح کی رعنائی، بادِ مشک بُو کی انجمن سازی
زمیں کی وسعتوں میں رقص کرتے ان بگولوں کی

دلاتے یاد ویرانوں میں ان سر کش جوانوں کی
جو جہدالبقا کے ہر سمندِ باد پا کی باگ موڑیں گے
کسی مشکل میں بھی اللہ کی رسّی نہ چھوڑیں گے
کتابوں پر ہدایت کے لیے بھیجی ہیں جو تو نے
جزائے خیر و شر پر، حشر پر، جس دن میں اٹھوں گا
ردائے خاک اوڑھے اس زمیں کی آخری تہہ سے
یہ زیر ناف گھونسہ مارنے کی کیا ضرورت تھی
کھڑا ہے راستہ روکے ہوئے شیطان کیوں تخلیق کے دن سے

۳۰ مارچ ۱۹۹۴

کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

بیدار بخت

اختر الایمان نے ایک بار مجھے بتایا کہ نظم کا کوئی مصرع اچانک ان کے ذہن میں آتا تھا۔ اگر سوتے میں بھی آتا تو اٹھ کر اسے لکھ لیتے تھے۔ مصرع کی آمد کے بعد نظم مکمل ہوتے تک اکثر ایک مدت گزر جاتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مثلاً نظم "ایک لڑکا" کوئی اٹھارہ بیس برس میں مکمل ہوئی۔ کسی ایک نظم کو مکمل کرنے کا اتنا لمبا عرصہ میری سمجھ میں اس وقت آیا، جب میں نے ان کی حالیہ بیاضوں کا مطالعہ کچھ ان کی زندگی کے آخری دنوں میں کیا، اور کچھ ان کی وفات کے بعد 'زمستاں سرد مہری' کی ترتیب میں ان کی بیگم سلطانہ ایمان کا ہاتھ بٹاتے وقت کیا۔ تب مجھ پر کھلا کہ کسی ایک نظم کے نامکمل خیال کو زندہ رکھنے کے لیے اختر الایمان کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ اس کی فائل کھولیں اور کسی باضابطہ پروگرام کے تحت وقتاً فوقتاً اس کا مطالعہ کریں۔

کسی ایک مجموعے کی اشاعت، اخترالایمان کے لیے گویا ایک عہد کا اتمام ہوتا تھا، اس لحاظ سے کہ اس مجموعے سے متعلق ساری بیاضیں دفتر پارینہ میں داخل کردی جاتی تھیں۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس مشاہدے سے ہوا کہ وہ دس بارہ بیاضیں جو میں نے حال میں دیکھیں، ان میں "زمین زمین" یا اس سے پہلے کے کسی مجموعے کی کوئی نظم نہ تھی۔ "زمین زمین" جو ۱۹۹۰ میں شائع ہوا، ان کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعہ تھا۔ معلوم ہوا کہ پرانی بیاضیں تھیلے میں لپیٹ کر بیکار چیزوں کے بھنڈار میں ڈال دی گئیں۔

اخترالایمان کے شعر لکھنے کے عمل کی بظاہر بے قاعدگی میں ایک نظم و ضبط بھی تھا، جس میں کچھ تو حسن تربیت کا دخل تھا اور کچھ عادت کا جس کی تہذیب میں غالباً ٹوٹکوں کا ہاتھ بھی تھا اور ماحول کا بھی۔ کوئی پچاس برس پہلے جب سگریٹ بہت پیتے تھے۔ شعر لکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ شعر پنسل سے لکھیں اور جس پنسل سے نظم شروع کی اسی سے ختم بھی ہو، خواہ اس کا باقی حصہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ رہ گیا ہو۔ اگر وہ پنسل کھوجاتی تو نظم مکمل کرنے میں دقت ہوتی۔ اخترالایمان ضعیف الاعتقادی کو انسان کی کمزوریوں میں شمار کرتے تھے۔ ان دونوں ٹوٹکوں سے تو انھوں نے

کوشش کر کے چھٹکارا پالیا، مگر سب عادتیں نہ چھوٹ سکیں۔ عمر کے آخری برسوں میں لکھنے کی شرط یہ تھی کہ اپنے مختصر سے ڈرائنگ روم میں کھڑکی کی پاس، ہرے بھرے درختوں اور چڑیوں کی آوازوں کے پس منظر میں، اپنی مخصوص چوکی پر بیٹھے ہوں اور ہاتھ میں ایک قیمتی فاؤنٹین پین ہو۔

۲۴فروری ۱۹۹۳ کو مجھے لکھا " میرے لیے ایک اچھا سا قلم لانا۔ مجھے موں بلاں پسند ہے۔ کوئی اس سے بھی زیادہ دیر پا ہو تو اچھا ہے۔ نب موٹی ہو۔" لکھنے کی چوکی کے پاس ایک بریف کیس رکھا رہتا تھا، جس میں ضروری کاغذات رکھتے تھے۔ اس میں پانچ چھ قیمتی قلم تو میں نے بھی دیکھے تھے۔ ایک موں بلاں تھا، بہت پرانا اور موٹی نب کا۔

۱۹۹۵ کی گرمیوں میں، ان کی بیٹی رخشندہ نے ان کے دو بیڈ روم کے اپارٹمنٹ کی دوسری خواب گاہ کو اسٹڈی بنانے کی کوشش کی کہ اخترالایمان اس کمرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرسکیں، مگر انھوں نے اپنی چوکی نہیں چھوڑی، اس زحمت کے باوجود کہ چھت پر لگے پنکھے کی ہوا وہاں تک پوری طرح نہیں پہنچتی تھی۔ وفات سے کوئی مہینہ بھر پہلے ان کے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی مرمت کا کام شروع ہوگیا۔ کھڑکی کے آگے پاڑ بندھ گئی جس پر مزدور دن بھر ٹھوکا پیٹی کرتے اور دھول اڑاتے، جس کی وجہ سے کھڑکی بند کرنی پڑی۔ چوکی پر بیٹھنا بھی موقوف ہوگیا اور لکھنا بھی۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۵ کو اخترالایمان کی آخری سالگرہ کے دن، میں بمبئی میں تھا، اور حسب معمول ان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی دن ان کے گردوں نے جواب دے دیا، جس کی وجہ سے مثانے میں پیشاب جانا بند ہوگیا، نقاہت بڑھ گئی۔ اس دن یا شاید دو ایک روز بعد یہ طے پایا کہ کچھ رسالوں میں بھیجنے کے لیے ان کی دس بارہ بیاضوں میں سے کچھ مکمل نظمیں صاف کرکے (یعنی اپنے ناپختہ خط میں) لکھوں کہ آسانی سے پڑھی جاسکیں۔ انھیں دنوں میں ایک روز اخترالایمان صبح ڈائی اے لی سس کے لیے گئے۔ دوپہر کے قریب واپس آکر سوگئے۔ سہ پہر کے وقت جب اٹھے تو اپنی بیگم سے پوچھا کہ "بیدار چلے گئے۔" انہوں نے کہا " وہ کل جائیں گے"۔ جب مجھے دیکھا تو پھر پوچھا کہ " بھئی تم تو آج صبح جانے والے تھے۔" میں نے کہا، " اختر بھائی، میں تو کل صبح جاؤں گا۔ یہ تو آج کی شام ہے۔" کچھ دیر ہاتھوں میں سر لیے بیٹھے رہے پھر مضمحل سی آواز میں بولے" آج کل سب گڈمڈ ہوجاتا ہے۔" تھوڑی دیر بعد میں نے وہ نظم سنائی جو ابھی اتاری تھی، اس کا عنوان ایک بیاض میں "مریض" تھا دوسری میں "تشخیص" اور تیسری میں اس کے کئی مسودے تھے جن کا عنوان صرف " ایک نظم " لکھا ہوا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت کے باوجود کہ جس میں صبح و شام میں فرق کرنا مشکل ہو، انھیں یہ تعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ نظم کا آخری مسودہ وہ تھا جس کا عنوان

"تشخیص" تھا۔ اس نظم میں ایک مصرع ہے:

میرا مرَض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

میں اپنے نیم خواندہ ہم عصروں کی طرح لفظ 'مرض' کو بروزن فرض جانتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ "اختر بھائی، مرَض؟" تو فوراً حافظ کا ایک شعر سند میں سنایا کہ لفظ کا تلفظ وہی تھا جو انھوں نے باندھا تھا۔ میری حیرانی اور بڑھ گئی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کو ایسی بحرانی ذہنی کیفیت میں سند کے حافظ کا شعر یاد رہے۔ نظم "تشخیص" کا ایک مسودہ جس کا عنوان "ایک نظم" ہے:

مجھے یہ کون سے دارالشفا میں لائے ہو
یہ زرگزیدہ ہیں کچھ طالب ہوا و ہوس
مریض جو نظر آتے ہیں آس پاس مرے
گراں گزرنے لگا ہے مجھے ہر ایک نفس
سب اپنے درد کے درماں کی جستجو میں ہیں
کسی ایک ایسی جگہ دن لگے نہ ایک برس
وہاں چلو کہ طبیعت کو کچھ قرار آئے
ہر ایک ڈوبتے منظر پہ کچھ نکھار آئے
کوئی بھی آرزو پلٹے نہ سوگوار آئے
مرا مرَض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

X

نظم کے آخر میں ضرب کا نشان تب لگاتے تھے جب نظم مکمل ہو۔ یہ الگ بات کہ ہمیشہ ردّ و بدل کرتے رہتے تھے مگر لفظ کاٹتے کم ہی تھے۔ جس لفظ کو بدلنا ہوتا تھا اس کے نیچے لکیر کھینچ دیتے تھے اور نیا لفظ پاس ہی کہیں لکھ دیتے تھے۔ اوپر لکھی ہوئی نظم میں آخری سے پہلا مصرع اس طرح تھا:

ہوا چلے تو کھلیں پھول اور بہار آئے

اس مصرع کے نیچے ایک موہوم سی لکیر سے اندازہ ہوا کہ یہ مصرع نظم کے پہلو میں لکھے ہوئے مصرع سے بدلا گیا ہے۔

ایک روز میں شہر سے کالی داس گپتا رضاؔ کا مرتب کردہ "دیوان غالب" لایا۔ اخترالایمان کی بیگم، سلطانہ ایمان، کو دکھا رہا تھا کہ اس کتاب سے یہ فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ غالبؔ نے کون سا

شعر کس سال میں لکھا۔ "مثلاً یہ شعر دیکھیے ۱۸۶۷ میں لکھا تھا۔"

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ

اخترالایمان ڈائی اے لی سس کے بعد کی غنودگی میں تھے اور ہماری گفتگو میں شامل بھی نہ تھے مگر غالبؔ کا مصرع سنتے ہی چونکے اور ایک لمبی "ہاں" کے بعد دوسرا مصرع پڑھ دیا:

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

غالبؔ کے شعر میں غیر معمولی دلچسپی سے مجھے گمان ہوا کہ "تشخیص" کا یہ مصرع جو پہلے مسودے کے بعد نظم میں شامل کیا گیا، غالبؔ کے شعر سے متاثر ہوا ہوگا:

بشرگزیدہ ہوں میں لے چلو یہاں سے مجھے

زیر تذکرہ نظم کے کئی مسودے مختلف بیاضوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان مختلف بیاضوں کا مسئلہ بھی عجب ہے جو ابھی تک مجھ سے پوری طرح حل نہیں ہوا۔ وہ بیاضیں جو میں نے دیکھی ہیں، وہ سب ۱۴ سنٹی میٹر چوڑی اور کوئی ۲۰ سنٹی میٹر لمبی نوٹ بکس ہیں، اوپر سے بندھی ہوئی جسے اسٹینوگرافر استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر ان بیاضوں کے استعمال میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جب لکھنے کو جی چاہا، شاعر نے وہ نوٹ بک اٹھالی جو اوپر رکھی تھی۔ روزانہ کی جھاڑ پونچھ میں بیاضیں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہوں گی۔ ایک بیاض کے ایک صفحے پر صرف یہ تین مصرعے لکھے ہوئے ہیں، "ایک نظم" کے عنوان سے:

میں نے دیکھا ہے تجھے ربِّ کریم
خوش گلو رنگیں پرندوں کی حسیں آواز میں
آتی جاتی صبح کے اور شام کے انداز میں

اخترالایمان داخلی طور پر مذہبی تھے مگر مذہبی رسوم کے پابند نہ تھے، نہ نماز پڑھتے تھے نہ روزہ رکھتے تھے اور یہ طریقہ اپنے آخری دنوں میں بھی نہیں بدلا۔ کہتے تھے کہ بے دین آدمی اچھی شاعری نہیں کرسکتا۔ اوپر لکھے ہوئے تین مصرعے ایک حمد کے مصرعے معلوم ہوتے ہیں، مگر اخترالایمان کی حمد بھی رسوم کی پابند کیسے ہوسکتی ہے! ایک اور بیاض میں تین مصرعے ملے "خدا" کے عنوان سے:

میں تجھے روز، ہر لمحہ جلوہ نما دیکھتا ہوں
پھول کی پنکھڑی، دور گاتے پرندے کی آواز کے لحن میں
پھیلتے بڑھتے اور بے انت اس کائنات میں جگمگاتے ......

مگر معلوم ہوتا ہے کہ نظم آگے نہیں بڑھی۔ ایک اور بیاض میں یکے بعد دیگرے ایک نظم کے کئی مسودے ملتے ہیں، جن کا عنوان کہیں "خدا" ہے کہیں "عذاب کا موسم" اس بیاض میں آخری مسودہ "خدا" کے عنوان سے اس طرح ہے:

نہاں خانۂ دوش و امروز میں کوئی بیٹھا
مرے واسطے کتنے خوش آئند لمحے سجائے
جنھیں جیب و دامن میں بھر کر
مرا جذبۂ خوش نمائی جہاں کو دکھاتا رہا ہے
وہ ایک قصر خلوت ہے جس میں
چلا جاتا ہوں بے محابہ
وہ ایک ذات جو سراپا تصوّر ہے
پھر بھی مرے واسطے ایسی مہمیز ہے جو ہمیشہ
مجھے ایسے انگیخت کرتی رہی ہے
کہ میں دوڑتا پھر رہا ہوں
زمیں آسماں کی حدوں میں
پیالہ مری خواہشوں کا
تمناؤں سے گو لبالب بھرا ہے
مگر میں نے رک کر سپر ڈال دی ہے

ایسا لگتا ہے کہ شاعر ایک حمد کہنا چاہتا تھا مگر ابھی تک اپنی کاوش سے مطمئن نہ تھا۔ پھر اس نے وہ نظم لکھی جو "خدا" کے عنوان سے ہے۔ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ اخترالایمان نے یہ نظم کب شروع کی تھی مگر بیاضوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلے تین مصرعے اس نظم کے شروع کرنے سے پہلے لکھے تھے جو "پس منظر، پیش منظر" کے عنوان سے ہے اور جس پر تکمیل کی تاریخ ۱۱ اپریل ۱۹۹۳ درج ہے۔ نظم "خدا" پر تکمیل کی تاریخ درج نہیں ہے۔

اخترالایمان نظم میں پھیلاؤ کے قائل تھے مگر بیان کے طول سے بچتے تھے۔ وہ ایک اچھے مصور کی طرح اپنی وسیع تصویر کو برش کے کم سے کم اسٹروکس میں بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کی نظم "ذکر مغفور" کا ایک اولیں مسودہ اس بیان کی تصدیق کرے گا۔ اس نظم کے پہلے دس بارہ مصرعے جن میں "مغفور" کی رحلت کا ذکر ہے، تقریباً وہی ہیں جو "زمستاں سرد مہری

کا" میں درج کردہ نظم میں ہیں۔ مگر آخری دو مصرعوں کی بجائے یہ مصرعے ہیں:

قورمہ زردہ، خمیری روٹی
یعنی برسی کے لوازم سارے
صحن میں ہوں گے، صبا کا جھونکا
صحن گلشن سے چلا جائے گا گھر کے اندر
گھر کے افراد بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے سب
ہنس رہے ہوں گے گئے آدمی کی باتوں پر
اور غم، ہارے سپاہی کی طرح ست، اداس
بھاگتے لمحوں کی گردش میں پھنسا، قبر کے پاس
درد کی در بدری دیکھ رہا ہے بیٹھا
وقت کی جلوہ گری دیکھ رہا ہے بیٹھا

مجھے تو نظم کا یہ مسودہ زیادہ پسند ہے، مگر شاعر نے دو مصرعوں کے اختصار اور ابہام کو دس مصرعوں کے طول پر ترجیح دی:

گھر کے اندر سے کھنکتی سی ہنسی کی آواز
بہتے بہتے کھلے آنگن میں نکل آئی ہے

نظم کے ایک اور مسودے میں "قورمہ بریانی" والے مصرعے اس طرح ہیں:

زردہ، بریانی، بہت نرم خمیری روٹی
قورمہ کام و دہن چومتا معدے میں اتر جائے گا

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس بیاض میں یہ مسودہ درج ہے اس کے شروع کے صفحوں میں مختصر نظم "نیاز" کا ایک مکمل اور کئی نامکمل مسودے ہیں، ان میں خمیری روٹیوں اور قورمہ کا ذکر اسی حوالے سے ہے جیسا اوپر کے مصرعوں میں ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کسی شخص کی موت کے بعد کی کھانے پینے کی رسموں سے جھنجلایا ہوا ہے۔ اس جھنجھلاہٹ کی شدت "ذکر مغفور" کے پہلے مسودے تک مدھم پڑ جاتی ہے اور آخری مسودے تک معدوم ہو جاتی ہے کہ شاید تب تک وقت نے شاعر کے زخموں کو اس حد تک بھر دیا تھا کہ واقعیت کے ساتھ یہ قبول کرسکے کہ بڑے سے بڑا ذاتی المیہ بھی دیرپا نہیں ہوتا۔ نظم "نیاز" "زمستاں سرد مہری کا" میں اس لیے شامل کر دی گئی ہے کہ مکمل تھی، مگر ممکن ہے اخترالایمان خود اسے اپنے مجموعے میں جگہ نہ دینا چاہتے، کہ ذرا

بلند بانگ ہے۔

اخترالایمان کی وفات کے بعد کئی لوگوں نے کہا کہ ان کی نظم "ذکر مغفور" سوانحی پیشین گوئی تھی۔ میرے خیال میں یہ نظم اور "نیاز" دونوں انھوں نے اپنے جواں سال داماد اور مشہور فلمی اداکار امجد خان کی وفات پر لکھی تھی، جن کے چالیسویں میں میں نے بھی دیکھا تھا کہ ان کے وسیع مکان کے بہت بڑے کمرے میں مہمان قورے بریانی سے بھی تصرف کررہے تھے اور کاروباری داؤں پیچ میں بھی مصروف تھے۔ امجد کا انتقال ۱۹۹۲ میں ہوا۔ "ذکر مغفور" کے آخری مسودے پر ۳ مارچ ۱۹۹۴ کی تاریخ درج ہے۔ نظم میں "کمر بستہ غلام، دوربین آنکھیں، محافظ بازو" ایک ایسے متمول آدمی کی تصویر ذہن میں بناتے ہیں جو ہر وقت مصاحبوں اور ملازموں میں گھرا رہتا ہو۔ یہ تصویر امجد خان کی یقیناً تھی مگر خود شاعر کی ہرگز نہیں۔

اخترالایمان نے اپنے ایک دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ کسی تجربے کو نظم کے سانچے میں تب ڈھالتے ہیں جب وہ تجربہ ایک یاد میں تبدیل ہوجائے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ کسی تجربہ پر مبنی نظم سے مطمئن اس وقت ہوتے تھے جب تجربہ نظم میں ایسے آئے کہ تجربے کی ہنگامی جذباتیت سے عاری ہو۔ اخترالایمان نے تجربہ سے فوراً متاثر ہوکر نظمیں کہی ہیں، یہ الگ بات کہ ان میں سے بیشتر چھپوائیں نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو میری بات سے اتفاق نہ ہو کہ "نیاز" ایک خاص واقعہ کے فوری ردّعمل میں لکھی گئی تھی مگر "رام راج بجنور میں" کو کیا کہیں گے؟ یہ ان کی چھپی ہوئی ان چند نظموں میں سے ہے جنھیں ہنگامی کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نظم "رام جنم بھومی، بابری مسجد" کے تنازعے کے فوری بعد ہونے والے فرقہ واری فسادات کے بارے میں ہے جس میں شاعر کے قریبی رشتہ داروں کی جانیں بھی تلف ہوئی تھیں۔ میرے ٹوکنے کے باوجود، اخترالایمان نے اصرار کیا کہ اس نظم کو ان کے شعری اثاثے کا ایک اہم جزو سمجھا جائے۔

اختر الایمان پر ۱۹۴۷ کے فرقہ واری فسادات کا بھی اثر تھا مگر ان فسادات کے بارے میں جو شعر لکھے ان پر تکمیل کا سال ۱۹۷۲ درج ہے، یعنی سانحہ کے بیس پچیس برس بعد لکھے گئے:

فسادات دیکھے تھے تقسیم کے وقت تم نے
ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈنٹھلوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستان بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھی تھیں کیا بین کرتے (راہ فرار)

نہ صرف یہ کہ اوپر لکھے ہوئے شعر سانحہ کے برسوں بعد لکھے گئے بلکہ ان سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا

کہ راوی کس فرقے کا فرد ہے۔ زیر تذکرہ بیاضوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۲۔۱۹۹۳ کے ہندو مسلم فسادات کا اثر اختر الایمان پر بہت گہرا ہوا۔ جگہ جگہ بکھرے ایک ایک، دو دو مصرعے، یا نا مکمل نظموں کے مسودے، شاعر کے کرب کی گواہی بھی ہیں اور اس جذباتیت کا اظہار بھی جس کے تحت اسے اپنی شناخت ایک فرقہ کے ساتھ کرانے میں کوئی باک نہیں تھا۔ اس کی کئی مثالیں ہیں :

ع اک تانڈو نرت آگئے دنیا کو دکھانے

ع دیوار حرم توڑ کے ہے شاد برہمن

ایک نا مکمل نظم کا مصرع، جس کا عنوان ''مسلمان'' ہے :

ع میں تاریخ کی دھول میں کھو گیا

ایک اور نا مکمل نظم کے یہ مصرعے:

عروسِ شہر کی عصمت دری کا نوحہ لکھنے کو
ابو ریحان بیرونی کا ہمسر کوئی آئے گا
کہ میں تو دم بخود ہوں، جیسے زندہ ہوں نہ مردہ ہوں

یا پھر ایک اور نا مکمل نظم ''۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ کی رات'' جس کے دو تقریباً ایک جیسے مسودے ہیں:

بطن شب سے نہیں ہوا پیدا
واقعہ ایسا اک جنوں افزا
جب گھروں میں سہم گئے تھے لوگ
خوف سے جیسے جم گئے تھے لوگ
لوگ چلاتے تھے کہ اے معبود
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ کیوں ہوا برپا
دوسرا کون ہے یہ تازہ خدا
یہ زمیں تیری، آسماں تیرا
شرق سے غرب تک جہاں تیرا
پیڑ پودے، گل و گیاہ تیری
سب پہ یکساں رہی نگاہ تیری
پر یہ ہے کون جو یہ کہتا ہے
شہر میں جو کوئی بھی رہتا ہے
اس کا محکوم ہے غلام ہے وہ
اس کے ہی زیر انتظام ہے وہ
حاکم شہر، محتسب، قانون
سوگئے کھا کے سب افیون
شہر کا کچھ خیال ہی نہ رہا
کوئی پرسانِ حال ہی نہ رہا
رہ گیا آسمان، کچھ بھی نہیں
روٹی کپڑا مکان، کچھ بھی نہیں

اختر الایمان کی ایسی جذباتیت کا مکمل غیر موسوم اظہار "گرم ہوا" میں ملے گا، اور مکمل موسوم اظہار "رام راج بجنور میں" نام کی نظم میں۔ یہ دونوں نظمیں "زمستاں سرد مہری" میں شامل ہیں۔ بیاضوں میں ایک نا مکمل نظم ہے جس میں عروس البلاد، بمبئی، میں بدامنی کے بہانے انسان کی "ناانسانیت" کا ذکر ہے۔ "ایک نظم" کے عنوان سے ایک ہی بیاض میں یکے بعد دیگرے کئی نا مکمل مسودے ہیں۔ آخری مسودہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

عروسِ شہر کی عصمت دری کا نوحہ کیا لکھوں
کہ میں خود ایک لاعلمی کے جنگل میں بھٹکتا ہوں
وسائل سب ہیں علومات کے اس عصر حاضر میں
مگر میں راہ گم کردہ ہوں، گونگا اور بہرہ ہوں
ہوا کرتا ہے گرد و پیش میرے رات دن کیا کیا

سمجھتا ہی نہیں بس اپنی ہی دنیا رہتا ہوں
رفاقت، درگزر، الفت کا رشتہ، دوستی سب سے
وہ سب تو ٹھیک ہے یہ بھی تو سوچو چاہتا کیا ہوں
شمار اہل بصیرت میں نہیں پھر بھی ضروری ہے
خبر حالات حاضر کی رہے، دنیا میں رہتا ہوں
مگر اک میں ہی کیا سب اس مرض میں مبتلا نکلے
کوئی بینا نہیں اس مملکت میں، میں تو اندھا ہوں
بھٹکتا پھر رہا ہے نالہ دل، دودِ محفل، بوئے گل ابتر
مرا وہ حال جیسے راہ میں نقشِ کفِ پا ہوں
قبائے مہ رُخاں ہاتھوں میں ہے غولِ بیاباں کے
سبھی فریاد رس نا مہرباں تھے بزم امکاں کے
خدا عرش معلیٰ پر کہیں بیٹھا ہوا چپ تھا
فرشتے لڑ رہے تھے اس سے، کیا تو نے کیا پیدا
یہ کتا ہے، نہ بلّی ہے، نہ چمگادڑ، نہ بندر ہے
نہ چیتا، شیر، کچھوا یا لکڑبگھا، نہ اجگر ہے
نہ چوہا، نہ زمیں پہ رینگنے والا کوئی کیڑا
نہ بن مانس، نہ گینڈا ہے، عجب ہی ڈھنگ ہے اس کا
یہ کیا مخلوق ہے جس کی کوئی کل ہی نہیں سیدھی
زمیں پہ رہ کے بھی سمجھا نہیں، کیا چیز ہے دھرتی
عطا ہے تیری، تو نے اس کو مرغزاروں سے سنوارا ہے
بہت سے موسموں کا اس کو پیراہن اوڑھایا ہے
نکالے ٹھنڈے چشمے، سیکڑوں دریا بہائے ہیں
ہزاروں قسم کے پھل پھول اور پودے اگائے ہیں
چمن دے کر گلوں کو بھینی خوشبو بخش دی تو نے
اگائیں کھیتیاں، دی ہے ہوا کو تازگی تو نے
پہاڑوں کی بلندی کو دیے اڑتے ہوئے بادل

فراز کوہ سے گرتی ندی میں بجتی ہے چھاگل
فلک پر چاند سورج دے کے اس کو روشنی دی ہے
ہیولی گوندھی مٹی سے بنا کر زندگی دی ہے
یہ تیرا نام لے کر قتل و غارت کرتا رہتا ہے
حرم کو توڑتا ہے، خوش نما منبر گراتا ہے
یہ خود ہی گھر بناتا ہے، انھیں خود ہی جلاتا ہے
ہمیشہ تیرے اوتاروں نے دنیا کو خوشی دی تھی
پیام آشتی دینے کو آئے، سرخوشی دی تھی

بیاض میں یہ نظم اچانک ختم ہوجاتی ہے اور اس کے فوراً بعد وہ نظم شروع ہوتی ہے جو"۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ کی رات" کے عنوان سے پہلے درج کی گئی ہے۔ آپ کو بھی یہ خیال آیا ہوگا کہ اگر اختر الایمان اوپر لکھی ہوئی نظم کو مختصر کرکے مکمل کردیتے تو یہ ایک اچھی نظم ہو سکتی تھی۔

بیاضوں میں ایک اور نامکمل نظم ملی، جس کا عنوان " تصویر بتاں" ہے:

سردی اپنے زوروں پر تھی
سب انگیٹھی تاپ رہے تھے
" چلغوزے ہوتے تو اچھا ہوتا"
شفقت بولی
"چٹخارہ بھی بری بلا ہے"
خالد نے شفقت کو چھیڑا
"پیٹو" چلغوزے ہوتے، تم سب خود ہی کھا جاتے "
شفقت جھلائی
"کہتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے"
خالد نے پھر شفقت کو چھیڑا
"جھوٹے دنیا بھر کے، تم سچ کیا بولو گے"
شفقت پھر جھلائی
"تم سے جو وعدہ ہے وہ پورا کر کے چھوڑوں گا"
خالد کی آنکھوں میں ایک شرارت ناچی

"مجھ سے کیا وعدہ ہے؟"
شفقت نے آواز دبا کر پوچھا
"سب کے سامنے ایسی راز کی باتیں مت پوچھو"
خالد کی اس بات پر شفقت مارنے دوڑی
خالد اٹھ کر دوسرے کمرے کی جانب بھاگا
شفقت جھلاتی، بکتی اس کے پیچھے بھاگی
باقی بچے بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے سب
میں اور لماں بیٹھے یہ سب باتیں سنتے تھے
"لماں ان کی شادی کردو"

یہ نامکمل نظم سنا کے میں نے پوچھا "اختر بھائی' یہ کہانی ادھوری کیوں چھوڑ دی؟" ان کے جواب میں نظم کے بارے میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی "شروع میں ٹھیک لگی تھی، مگر آگے نہیں بڑھی۔ چلو، دوسری نظم پڑھو۔" اس نظم نے مجھے "کل کی بات" اور "ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر" کی یاد دلائی، جن کی کلید آخری دو تین مصرعوں میں ملتی ہے۔ بہت سے پچھتاوں میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ نہیں پوچھا کہ "تصویر بتاں" میں کیا کہنے کا ارادہ تھا۔

"زمین زمین" کے بعد کی ان نظموں میں جو رسالوں میں چھپ چکی ہیں، مجھے کوئی ایسی نظم نہ ملی جس کے کم سے کم دو مسودے بیاضوں میں نہ ہوں۔ گویا شاعر ہر نظم چھپنے کے لیے بھیجنے سے پہلے اس پر نظر ثانی ضرور کرتا تھا اور نظر ثانی کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ دوبارہ لکھی جائے۔ صرف شعر ہی نہیں۔ اخترالایمان نثر پاروں کو بھی کم از کم دو بار لکھتے تھے "سوغات" میں قسط وار چھپنے والی سوانح عمری" اس آباد خرابے میں" کی تقریباً سب قسطوں کے دو دو مسودے میں نے ان کے کاغذات میں دیکھے ہیں۔

جب دلی کی اردو اکادمی نے اختر الایمان کی سوانح عمری چھاپنے کی خواہش ظاہر کی تو کہہ دیا کہ سوغات میں چھپی ہوئی قسطوں سے کتابت کرالیں۔ مجھے بتایا کہ جب پورا کتابت شدہ مسودہ آئے گا تو پڑھ کر ردوبدل کروں گا۔ افسوس کہ جب تقریباً پوری کتاب کا کتابت شدہ مسودہ آیا تو ان کے لکھنے کی چوکی کے برابر والی کھڑکی، بلڈنگ میں مرمت کی وجہ سے بند کرنی پڑی تھی اور تب تک قویٰ بھی مضمحل ہو چکے ہوں گے۔ کتابت کے دو چار صفحے ہی پڑھ سکے۔ ان کی وفات کے مسودے کی پروف ریڈنگ ایک بار میں نے کی اور ایک بار سلطانہ ایمان نے (یہ الگ بات کہ پھر بھی کتابت کی

غلطیاں چھپنے میں رہ گئیں)۔

وہ نظمیں جن کا صرف ایک مسودہ بیاضوں میں ملتا ہے، چار قسموں کی ہیں۔ ایک وہ جن کے نیچے ضرب کا نشان لگا کر شاعر نے بتا دیا کہ جو بات وہ کہنا چاہتا تھا اس مسودے میں آگئی ہے۔ ایسی نظمیں "زمستاں سرد مہری کا" میں اس احساس کے ساتھ شامل کردی گئی ہیں کہ اگر زندگی کچھ اور وفا کرتی تو اختر الایمان انھیں چھپوانے سے پہلے ان کی نوک پلک ضرور سنوارتے۔ ایک مسودے والی "مکمل" نظمیں جو "زمستاں سرد مہری کا" میں شامل ہیں، ان کی تعداد صرف سات ہے۔ وہ نظمیں ہیں : خلا، نظم نمبر ۱ تا ۵ اور نظم نمبر ۷۔

دوسرے قبیل کی ایک مسودے والی نظمیں وہ ہیں جن کے نیچے تکمیل کی سند بطور نشان ضرب نہیں ہے مگر جو سلطانہ ایمان اور مجھے دونوں کو مکمل لگیں۔ مثلاً یہ نظم آپ بھی دیکھیے جس کا عارضی عنوان "ایک نظم" ہے:

وہ کیا ہے جو ہوا ہے اس طرح وجہ پریشانی
وہ سب جو اچھا لگتا تھا وہ اب کیسے نہیں لگتا
وہی تو لوگ ہیں صورت بھلے ہی دوسری ہوگی
انھیں حالات میں بیشی کمی ہے جن کا عادی تھا
پرندے بھی وہی ہیں، آسماں بھی، ہیں وہی منظر
مجھے کیا ہوگیا خفقان، پاگل پن، کوئی سودا
ہوائیں گرم ٹھنڈی ہیں، وہی موسم بدلتے ہیں
ثمر باری وہی ہے، ویسے ہی سب پھول کا کھلنا
زمیں بھی، آسماں بھی سب وہی اڑتے پرندے بھی
وہی ہیں بولیاں ان کی، فضا میں ڈوبنا اٹھنا
عوامل بھی وہی ہیں، کچھ نہیں کار جہاں بدلا
حکومت کیا کرے گی آدمی ہی رہ نما بھی ہیں
ہر اک کے بال بچے ہیں، ضرورت ہے، تقاضا ہے
نظامت اس لیے تو لی نہیں تھی بھوکے مر جائیں
اگر قلاش ہی ہونا تھا کرتے دوسرا دھندا

وہی سڑکوں پہ محشر خیزیاں ہیں، بھیڑ ہے ویسی
گلی کوچوں میں ہنسنا بولنا، سب شور بچوں کا
سبھی کچھ تو وہی ہے، بیل گاڑی، بھاگتی ریلیں
وہی تالاب، جھیلیں، نہر، دریا، ندیاں ساری
ذرا تھوڑی سی تبدیلی ہے، پانی ہوگیا گندا
وہی ہے کس مپرسی آدمی کی، جبر ہستی ہے وہی سارا
وہی ہے جہل بھی اور علم بھی، الفت ہوئی عنقا
یہ میں ہی سوچتا ہوں یا چلن دنیا کا بگڑا ہے

مجھے تو یہ نظم بھی مکمل لگی اور نیچے لکھی ہوئی مختصر نظم بھی جس کا عنوان بھی "ایک نظم" ہے:

ترا کمال یہ ہے تو زمیں پہ لایا مجھے
مرا کمال یہ ہے آج تک بھی زندہ ہوں
ترا کرم بھی ہے شامل تضاد عالم بھی
مری نہاد میں اب یوں ہوا ہے سمجھوتا
جہاں سے چاہوں نیا موڑ لے لوں، مصلحتاً
میں خدا ہی نہیں آدمی بھی ہوں تھوڑا

اختر الایمان کو میں نے نیچے لکھی ہوئی نظم بیاضوں سے پڑھ کر سنائی تو بولے " ہاں ٹھیک ہے مگر ابھی صاف ہونی ہے۔"

روح ویران ہے، سب صوم و صلوٰۃ
جیسے رشوت ہے، خدا کو دے کر
میں نے سودا کیا فردوس کے اس منظر کا
جس میں حوریں بھی ہیں، غلمان بھی، موجِ کوثر
غرق کرنے کو بڑھی آتی ہے میری جانب
اے خدا میں تری رحمت کا طلب گار نہیں
تیری چاہت ہے سرکوہ کہ آ
ہم کلامی کہاں، جلووں کا سزا وار نہیں
رہ نما اس کو بنا کر کوئی جبریل نہ بھیج

مجھ کو اس فکر کی دلدل سے نکال
مجھ کو بت خانہ و محرابِ حرم دونوں نے
ایک نرغے میں لیا ہے جیسے
ایک مقصد نہیں معلوم، میں کیوں آیا ہوں
اور ہر لمحہ مری زیست کا نافہم سوال

ایک مسودے والی نظموں میں تیسرے قبیل کی نظمیں وہ ہیں جو ہر لحاظ سے نا مکمل ہیں مگر جن میں مصرعے اتنے ہیں کہ نظم کی شکل مبہم ہی سہی نظر آتی ہے۔ یہ تقریباً سب نا مکمل نظمیں یہاں اس خیال سے درج کی جا رہی ہیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ ان میں سے بیشتر کے عنوان "ایک نظم" ہیں:

ایک نظم

گزرتے وقت کے پس منظروں میں ایک یہ بھی ہے
جہاں درماں طلب مجھ سا، جہاں اک مہرباں تم سا
جہاں اک تشنہ لب مجھ سا، جہاں تسکینِ جاں تم سا
کھڑا ہے وقت کو روکے تبسم خیز خفگی سے
دل آرائی کی ساری منزلوں کو چھوڑ کر پیچھے
گزرتے وقت کے پس منظروں میں، درد کا حصہ
جہاں جب چاند کی پرچھائیں بھی کروٹ بدلتی ہے
فضا مسحور ہو جائے، ٹھہر جائے کسی ایک ایسے نقطے پر

اس نظم کو پڑھ کر ایک جھنجھلاہٹ اور محرومی کا سا احساس ہوا، جیسے کسی وجہ سے ایک پر اسرار فلم کا انجام نہ دیکھنے کو ملے۔ ایک اور نا مکمل نظم اسی نوع کی ہے:

ایک نظم

موسموں کی دوڑ دھیمی پڑ گئی
وقت کے قدموں کی چاپ
اب کسی جانب سے آتی ہی نہیں

لمحہ دو لمحہ ستاتی ہی نہیں
کس جگہ چھوٹا تھا ساتھ
ہم کہاں تھے جب یہ ہنگامہ ہوا
ہاں وہاں سے موڑ لینا تھا ہمیں
اس طرف جانا تھا جس جانب کوئی
آدمی بھولے سے بھی جاتا نہ تھا
اس طرف جنسی تلذذ کا کوئی ساماں نہ تھا
عورتوں کے جسم کی خوشبو نہ تھی
بیل بوٹے اور گھنی چھاؤں نہ تھی
ایک بنجر سی زمیں تھی سامنے
جس کو اپجاؤ بنانے کے لیے
سخت محنت کی ضرورت تھی ابھی

بیاض میں اوپر لکھی ہوئی نظم عجب طریقے سے رقم ہے۔ ایک صفحے پر پہلے آٹھ مصرعے درج ہیں، اور اس کے بعد کئی صفحوں پر دو تین نظموں کے مسودے ہیں۔ نظم کے باقی مصرعے بھی انھیں صفحات میں ہیں مگر دوسری نظموں کے مسودوں سے بچی ہوئی جگہ میں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر اختر الایمان ایک سائنٹسٹ یا ریسرچ انجینئر کی طرح اپنے ہر منصوبے، یعنی نظم، کی الگ فائل بنا لیتے تو بہت سی وہ نظمیں انجام تک پہنچ جاتیں جو بیاضوں میں کھو جانے کی وجہ سے ادھوری رہ گئی ہوں گی۔ پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ آدمی اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا مرکب ہوتا ہے۔ اگر اس کی کمزوریاں نکال دی جائیں تو اس کی کچھ خوبیاں بھی نکل جائیں گی۔ اگر اختر الایمان کے لکھنے کا نظم ایک ریسرچ انجینئر کی طرح ہوتا تو ممکن ہے کہ ان کی شاعری بھی ریسرچ انجینئر کی شاعری جیسی ہوجاتی۔ شاید یہ نامکمل نظمیں تاوان ہیں ان مکمل نظموں کا جو نہ صرف اردو ادب کے لیے باعث افتخار ہیں بلکہ جن پر عالمی ادب بھی ناز کرسکتا ہے۔ اختر الایمان کو کسی نے نوبیل پرائز کے لیے نامزد کیوں نہیں کیا؟

اوپر لکھی نامکمل نظم کے فوراً بعد، ایک اور نامکمل نظم ہے، جس کا عنوان عجیب سا ہے: خوفیت کا پودا۔ شاعر نے لفظ خوفیت کو واوین میں لکھ کر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ لفظ نیا ہے یا

ماخوذ ہے:

خوفیت کا پودا

اب سے کچھ برس پہلے
"خوفیت" کا اک پودا
صحن میں لگایا تھا
ہم سمجھتے تھے سودا
منفعت نہیں دے گا
لیکن آج بڑھ کر وہ
پیڑ بن گیا پورا
اس کی چھاؤں میں بیٹھے
گرد و پیش کو بھولے
اپنی ذات میں ڈوبے
اس کی چھاؤں کا ہم پر
یہ اثر ہوا جیسے
زندگی نئی پائی
ہوش جب ذرا آیا
منکشف ہوا یہ راز
جسم پھیلتا گیا لیکن
روح کر گئی پرواز

سب بظاہر نامکمل نظمیں صرف "ایک نظم" کے عنوان سے بے عنوان ہیں۔ نا مکمل نظموں میں سے ایک کا عنوان ہے "اقبال جرم" اور دوسری کا "مکتی" یہ دونوں نظمیں نیچے درج ہیں:

اقبال جرم

میں پریشاں روح تھا

اس زمیں پر آ گیا تھا جرم کی پاداش میں
جرم میرا تھا ازل کے دن مجھے
اعتراض اس بات پر تھا خلق آدم سے زمیں
آگ کا گولا نہیں، انساں بنا دے گا اسے
اپنی حق گوئی کے ہاتھوں ہوگیا معتوب میں
حکم صادر ہوگیا، تم بن کے انساں کا ضمیر
ہر قدم پر ساتھ رہنا، وہ تمہارا ہے اسیر

"سروساماں" کے دیباچے میں اختر الایمان نے لکھا تھا کہ "پیغمبر اب نہیں آتے مگر چھوٹے پیمانے پر یہ کام اب شاعر کر رہا ہے۔" ممکن ہے کہ "اقبال جرم" ایک نا مکمل نظم نہ ہو بلکہ اس خیال کی ایک مکمل توضیح ہو۔

مکتی

یہ وقت ہے سب چھوڑ کے دنیا کی خرافات
جو عمر بچی یادِ الٰہی میں بتائیں
سب ختم ہوئے جتنے بھی تھے قومی مسائل
آزادی کی تحریک کو اب دیجے دعائیں
انگریز ہوئے عازمِ برطانیہ آخر
اس قوم کی گاڑی کو جدھر چاہیں چلائیں
یہ اہل وطن، چھوٹے بڑے، ہندو مسلماں
ہر سمت سے اب آتی ہیں فرخندہ ہوائیں
وہ شیر ہو بکری ہو، نہیں اب کوئی تعریف

تین اور بے عنوان نا مکمل نظمیں اس طرح ہیں:

ایک نظم

کیسا شاداب لگا تیرا روپہلی پیکر
لطف و مستی کے تو در بند ہوئے تھے مجھ پر
عہد وارفتگی کس راہ سے واپس آیا

میں اسے کش مکش زیست میں چھوڑ آیا تھا
جب مرے جسم کو آلام نے ایسا گھیرا
ہر بنِ مو سے نکلنے لگی آہوں کی صدا
صبحِ فردا کا کہیں کوئی تصور نہ رہا
تب تم اک پردۂ اخفا سے نکل کر آئیں

ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے دل لگی کرنے کے لیے نظم کو ایک ایسے نازک مقام پر چھوڑ دیا ہے کہ پڑھنے والے اس سسپنس میں ہمیشہ مبتلا رہیں کہ اس کہانی کا انجام کیا تھا۔

ایک نظم

یہیں کہیں پہ کوئی غم بھری کہانی ہے
ہوائیں جس کی مجھے بار بار چھوتی ہیں
زمیں کے کون سے خطے سے اس کا ناتا ہے
کہ شرق و غرب، جنوب و شمال کوئی بھی ہو
بندھے ہیں سارے کے سارے اس ایک دھاگے سے
جو عرفِ عام میں اک لفظ "آدمیت" ہے

ایک نظم

برس گزرے، میں جب چھوٹا تھا، پگڈنڈی پہ بیٹھا تھا
اچانک موہنی سی ایک لڑکی پاس سے گزری
بھلا کیوں راہ میں بیٹھا ہے، کس کی کھوج ہے تجھ کو
تمہاری، میں نے للچاتے ہوئے دیکھا اسے، بولی
دوانہ ہوگیا ہے، جستجو کر میری، بڑھ، آگے ملوں گی میں
وہیں بیٹھا رہا میں آتے جاتے موسموں کے رنگ میں ڈوبا
لیے اک خوانِ نعمت سر پہ اک خادم رکا اور پیار سے پوچھا
بھلا کیوں راہ میں بیٹھا ہے، کس کی کھوج ہے تجھ کو
تمہاری، میں نے للچاتے ہوئے دیکھا اسے، بولا
دوانہ ہوگیا ہے، خوانِ نعمت کیا نوالہ بھی نہیں ملتا

ایسی اچھی اٹھتی ہوئی نظم کو نامکمل چھوڑ کر جانا زیادتی ہے۔

ایک نظم

وہ تم نہیں ہو مگر تم ہی سا تھا شخص کوئی
دیا تھا رنگ مری صبح و شام کو جس نے
شکستہ پائی کو مہمیز دی امیدوں کی
بھلا بھلا سا جہاں ساز تھا شگفتہ سا

صرف ایک مسودے کی چوتھی قبیل کی نامکمل نظمیں وہ ہیں جن کو "نامکمل نظمیں" کہنا بھی مناسب نہیں کہ وہ صرف چند مصرعوں پر مبنی ہیں، جو شاعر کی بے پناہ آمد کی گواہی کے طور پر یہاں درج کی جا رہی ہیں، ان عنوانات کے ساتھ جو شاعر نے خود لکھے تھے:

ترانہ

اٹھو مل کے گائیں وطن کا ترانہ
مدھر پیارا پیارا سجیلا سہانا
یہ چھل چھل چھلکتے ہوئے ندی نالے

گلشن نا آفریدہ

میں کب سے رہ رہا ہوں اس گھر میں کہہ نہیں سکتا
کوئی تاریخ، کوئی واقعہ تحریک دی جس نے
کہ سنگ و خشت کی دنیا سے اس وادی میں آجاؤں
نہیں یاد آتا، کس نے کیا کہا، اکسایا تھا کس نے
یونہی دھندلا سا اک نقشہ ہے میرے ذہن میں جب میں

ایک نظم

آج میں نے سحر دم خدا سے کہا
مجھ کو دولت بھی دے، آبرو اور عزت بھی دے
میرے دل کو جواں سال راحت بھی دے

مجھ کو سفاک لوحی سے محفوظ رکھ
اور دل میں مرے ایسی شفقت بھی دے
سحر ثابت ہو جو دل زدوں کے لیے
نرم گفتاریوں میں رفاقت بھی دے

بلبل

اپنے پنجوں میں لے اڑا بلبل
بیج ایک پیڑ کے جن کو
اور ہی پیڑ میں اگانا تھا
دانہ دنکا تو اک بہانہ تھا

ایک نظم

خدایا! مری زندگی کا سفر تو نے پہلے سے طے کر دیا
یا مجھے یونہی ظلمات میں چھوڑ کر خود الگ ہو گیا
زمیں کو یونہی میں نے مامن سمجھ کر گزارا

ایک نظم

سائباں سر پہ جو ہر آن بدلتا رہا ہاتھ
ایسے لمحے جو ٹھہر کر کبھی دے نہ سکے ساتھ
بھاگتے دوڑتے کیا جمع کیا تھا میں نے

ایک نظم

کہاں بھاگ جاؤ گے اس کار زار جہاں سے
کہ دامن پکڑنے کو کتنے کھڑے ہیں

ایک نظم

بڑا سا پیڑ تھا برگد کا بستی کے کنارے پر
جہاں پر بیٹھ کر اکثر پرندے پر سکھاتے تھے
وہیں سے دائیں جانب راستہ جاتا تھا مسجد کو

اختر الایمان نے فلموں کے مکالمے تو بہت لکھے مگر سوائے دو گانوں کے، فلم کے اور گانے اس لیے

نہیں لکھے کہ وہ شاعری کو اپنا آرٹ سمجھتے تھے اور نثر نگاری کو اپنا پیشہ، اور اپنے آرٹ کے بارے میں مفاہمت ہرگز نہ چاہتے تھے کہ ایسی مفاہمت کا ان کے آرٹ برا اثر پڑے گا۔ یہ مفروضہ اس طرح غلط ثابت ہوتا ہے کہ ان کی سوانح عمری "اس آباد خرابے میں" نثر میں ہے، جس کا داخلی ترنّم وہی ہے جو اوپر لکھے ہوئے تین مصرعوں کا ہے، اور جس صنف کو شاعر نے اپنے پیشے کے لیے مخصوص کر کے ایک طرح سے یہ فیصلہ کردیا تھا کہ اسے آرٹ کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ "سوغات" میں چھپے ہوئے مشاہیر کے بہت سے خطوط بتاتے ہیں کہ اخترالایمان کی نثر کو بھی غیر معمولی طور پر سراہا گیا ہے۔ عنفوان شباب میں اختر الایمان نے افسانے بھی لکھے تھے جو ساقی میں چھپے بھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ افسانے کوئی ڈھونڈ کر نکالے اور دوبارہ چھپوائے۔

ایک نظم

ناظر ہوں میں، سب دیکھتا ہوں بنتے بگڑتے
رکھا ہے مرے سامنے آئینۂ ایّام
آتے ہیں علم لے کے گزر جاتے ہیں پل میں

بغیر عنوان

مرے بیمار دل تجھ کو کہاں لے جاؤں، میں جانم
شفاخانوں میں تیرے درد کا درماں نہیں کوئی

اختر الایمان کو دل کا عارضہ تھا۔ ۱۹۸۶ء میں ٹی پل بائی پاس آپریشن ہوا، جس کے دوران ان کے قلب کی حرکت کچھ لمحوں کے لیے رک گئی تھی۔ آپریشن کے بعد زندگی تھوڑی بہت معمول پر آگئی مگر بیماریوں سے مکمل طور پر نجات نہیں ملی۔ کوئی چار سال پہلے ڈاکٹروں کو خدشہ ہوا کہ ان کے گردوں کا نظام خراب ہونے والا ہے۔ کچھ عرصے بعد خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ گردے خراب ہونے کی وجہ سے خون کا فضلہ جو پیشاب بن کر جسم سے نکلتا ہے، اب کچھ خون میں رہنے لگا۔ اس بیماری کا ایک علاج گردوں کا ٹرانس پلانٹ ہے جو ان کی عمر اور طبیعت کے مدنظر مناسب نہ تھا۔ دوسرا علاج ڈائی اے لی سس تھا، جس میں جسم کے تمام خون کو ایک مشین میں گزار کر صاف کرتے ہیں۔ ہفتے میں دو بار یہ علاج طے پایا، بدھ اور ہفتے کے دن۔ اس عمل میں کوئی چار پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

ڈائی اے لی سس کے دن سے پہلی شام خون میں فسادی مادہ بہت زیادہ جمع ہونے کی وجہ سے طبیعت مضمحل ہوجاتی تھی، بولنا چالنا کم ہوجاتا تھا اور لکھنا پڑھنا تقریباً بند۔ علاج کا دن آدھا تو علاج میں گزرتا تھا اور باقی سونے میں۔ اگر اٹھ بھی جاتے تو خاص طور پر آخری دنوں میں حالت کچھ ہذیانی سی رہتی تھی مگر دوسرے روز ایسے چاق چوبند اور تر و تازہ نظر آتے تھے کہ آپ کو شبہ بھی نہ ہو کہ سخت بیمار ہیں۔ میرے حساب کے مطابق اخترالایمان کو اپنی عمر کے آخری تین سالوں میں صرف آدھا وقت تخلیقی اور دیگر کاموں کے لیے ملا۔ باقی آدھا وقت بیماری اور اس کے علاج کی نذر ہوگیا۔ عجب نہیں کہ اوپر لکھے ہوئے دو مصرعے ذہن میں آئے۔ نظم ''تشخیص'' کا مضمون بھی وہی ہے جس کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ تین مصرعے بھی، زندگی اور موت کی مستقل کشمکش کا مظہر ہیں۔

ایک نظم

خدا تو ہے، ہمیشہ تھا، رہے گا بھی
مگر یہ جسم میں جو اک شرارہ ہے
لرز جاتا ہے جو ہر نامانوس جھونکے سے

بغیر عنوان

ایک شعلہ سا ہے وہ باد بہاری کیا کروں
اور مرے بس کی نہیں اختر شماری کیا کروں

ایک نظم

آج تو بے مہری حالات کا مارا ہوں میں
شادمانی آئے گی، سارا چمن کھل جائے گا
سوچتا ہوں اس خرابے میں کوئی پرسان حال
کس طرح آئے گا، کب، کیسے، کہاں سے آئے گا
آسماں سے خود بخود برسے گا اس فاقے میں بن
یا ہماری سرد مہری میں ابال آجائے گا

ایک نظم

پھونس کے چھپر کے نیچے
تازہ تازہ پکتی روٹی کی خوشبو
چولھے میں جلتی لکڑی کے انگارے
ان سے ریفریجریٹر میں رکھے باسی کھانے تک

اوپر لکھے ہوئے چار مصرعے، اخترالایمان کی حالیہ کئی نظموں کی طرح سوانحی معلوم ہوتے ہیں اور نامکمل ہونے کے باوجود بھی ذہن میں ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔

ایک نظم

مزیّن ہیں درو دیوار ایسے اشتہاروں سے
پتہ دیتے ہیں جو اس بات کا کچھ خاص ہی تقریب ہے کوئی
سنا ہے شہر میں سچ بولنے والا کوئی اللہ کا بندہ
کہیں سے آگیا ہے . . .
سر منبر کھڑا ہے جو پیامی وہ بھی جھوٹا ہے
سر مسند جو بیٹھا ہے نہیں ہے معتبر وہ بھی

شہر آشوب

ایک میں ہوں اور میری بے قراری ہائے ہائے
کس قدر بڑھنے لگی تخریب کاری ہائے ہائے
بھیڑ ہے اتنی چڑھا ہے آدمی پر آدمی
شہر میں ملتی نہیں کوئی سواری ہائے ہائے
سب خدا کے نیک بندے ہوگئے پیارے اسے
اب سوا لچوں کے ہوگی کس سے یاری ہائے ہائے
دیکھ لو کیا ہوگئی حالت ہماری ہائے ہائے
ہم ہیں اور دن رات کی اک بیقراری ہائے ہائے

اگر غالب کی زمین میں غزل کے سے یہ شعر کسی کمتر شاعر کے ہوتے تو میں انھیں قابل ذکر بھی نہ سمجھتا۔ خدا جانے اختر الایمان کیا کہنا چاہتے تھے۔ (کہیں 'چڑھا ہے آدمی پر آدمی' ذکر میر کے ایک لطیفے سے ماخوذ تو نہیں!)

غزل اور غالبؔ کے ذکر سے یاد آیا کہ اختر الایمان ۱۹۹۰ کے شروع میں پاکستان گئے۔ وہاں ان کے اعزاز میں بڑے جلسے ہوئے، تقریریں ہوئیں، انٹرویو ہوئے، جن میں بار بار یہ بات پوچھی گئی کہ وہ غزل کے خلاف کیوں ہیں۔ کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے غالبؔ کا یہ شعر مثال کے طور پر پیش کیا کہ اگر غالبؔ اسی مضمون پر آج کے زمانے کے مزاج کے مطابق ایک نظم کہتے تو وہ نظم ایک بڑی نظم ہوتی:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

مشفق خواجہ، خامہ بگوش کے قلمی نام سے طنزیہ، مزاحیہ کالم لکھتے ہیں۔ انھوں نے اخترالایمان کے انٹرویو پر ایک کالم لکھا۔ جس کا عنوان رکھا "اگر غالبؔ اخترالایمان کے مشورے پر عمل کرتا تو بڑا شاعر ہوتا۔" میں نے اس کالم اور دوسری باتوں کے بارے میں اخترالایمان سے گفتگو ریکارڈ کی تھی۔ غزل کے بارے میں۔ان کے بیان پر جو لے دے ہوئی اس کے جواب میں انھوں نے کہا:

"ایک لفظ ہے اردو میں 'خلط مبحث'۔ کبھی کبھی کیا ہوتا ہے کہ بات کچھ کہی جاتی ہے مگر اگر سننے والے کی نیت میں تھوڑا سا بھی کھوٹ ہے تو وہ اسے لے اڑتا ہے اور کچھ کا کچھ بنا ڈالتا ہے۔ جس کا تم نے ذکر کیا وہ بات پچھلے دنوں جب میں کراچی گیا تو غزل اور نظم پر گفتگو کے دوران ہو رہی تھی۔ میں یہ بات دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ غزل اپنے Saturation point پر پہنچ چکی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہیے، یہ بھی ایک صنفِ سخن ہے لیکن آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ شاعری میں پھیلاؤ آئے، اس میں نئے نئے تجربات ہوں تو آپ کو نظم کی طرف توجہ دینی پڑے گی۔ یہی بات کچھ احباب کے ساتھ ہو رہی تھی جو ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرا اس میں کہنا یہ تھا کہ نظم کا میدان زیادہ بڑا ہے جب کہ غزل کی زمین ایک حد تک محدود ہے۔ اسی تعلق سے میں نے غالبؔ کے شعر کا حوالہ دیا تھا کہ غالبؔ اتنے بڑے اور اچھے شعر کے مَوضوع کو لے کر نظم کہتا تو کتنی بڑی نظم ہوتی۔"

یہ بات قابل غور ہے کہ اختر الایمان نے اس موضوع پر بہت سی باتیں کہیں مگر کہیں اپنی نظم "ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر" کا حوالہ نہیں دیا، جو ۱۹۷۹ میں مکمل ہوئی تھی اور جس کی بنیاد غالبؔ کے اس شعر پر ہے:

غنچہ پھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دیکھیے بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ میرا مقصد تو صرف اخترالایمان کی آمد کے مصرعوں کو لکھنا تھا۔

ایک نظم

خدا سے ناخدا تک اک سفر تھا جس میں بیچارا
فریبِ ذات کا مارا ہوا ایک آدمی محصور تھا اتنا
اسے اپنے سوا کچھ اور آیا ہی نظر . . .

ایک نظم

حبس دم ہو کر اڑے گر بلبلِ نالاں تو اس پرواز میں
کیا سکت ہے، درد کی پہنائیوں میں تیر کر جائے کہاں
گردشِ ایّام میں کس کی لگن پیہم رہی
رزق کی یا رزق کے پردے میں نادیدہ کسی عیّار کی
چاہنے والوں کو دوڑاتا ہے جو اتنا کہ تھک کر گر پڑیں
شمع روشن تو کہیں ہوگی جمالِ یار کی
آسماں در آسماں ہیں کوششوں کی منزلیں

ایک نظم

یادیں رہ جاتی ہیں، جیسے
تاج محل کے ساتھ ابھی تک
شاہ جہاں کا نام رہا ہے

ایک نظم

تو نے بخشا ہے دنیا کو گھنگھور اندھیرا
تو ہی لاتا ہے پاتال سے کھینچ سورج کا ڈیرا

تو ہی دیتا ہے کتوں کو روٹی اور گدھوں کو نوالا
تو ہی کرتا ہے اچھے لوگوں کا دنیا میں منہ کالا
تیرے آگے کہہ سکتا ہوں میں تو ڈرتا ہوں
"جیتا رہ" جب تو کہتا ہے جیتا ہوں "مرجا" جب کہتا ہے مرتا ہوں
تو نے ایسا جال کرامت کا دنیا میں پھیلا رکھا ہے
جب تو چاہے گا دھوپ رہے گی، جب تو چاہے گا سایا ہے

ایک نظم

ایسا ہوتا ہی رہا ہے کارگاہ دہر میں
جس پہ گاہے خوش ہوئے ہم اور کبھی ناخوش ہوئے
جیسے جب دیکھا ہمیں تم نے نگاہ لطف سے
ہم غبارے کی طرح ہر چار سو اڑتے پھرے
اور کبھی نامہرباں پایا تو بالکل بجھ گئے
تم کو تو سرمایۂ جاں سمجھا تھا ہم نے کیا ہوا

میں نے کچھ سال پہلے اخترالایمان سے پوچھا کہ "کیا آپ لکھنے کے فوراً بعد نظم چھپنے بھیج دیتے ہیں"۔ گفتگو ذرا اشتعال انگیز ہورہی تھی۔ میرے معمولی سے سوال کا جواب انھوں نے کچھ جھنجھلاہٹ میں دیا۔ یہ گفتگو میں نے ریکارڈ کرلی تھی، اس لیے اخترالایمان کا جواب حرف بحرف لکھا جاسکتا ہے:

" میری شاعری میرا اکتساب ہے۔ یہ میرا ریاض ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جتنی کتابوں میں ہیں اتنی ہی نظمیں کہی ہیں۔ بہت کہی ہیں۔ اس سے تگنی کہی ہیں۔"

کیا ہوئیں وہ، میں نے پوچھا

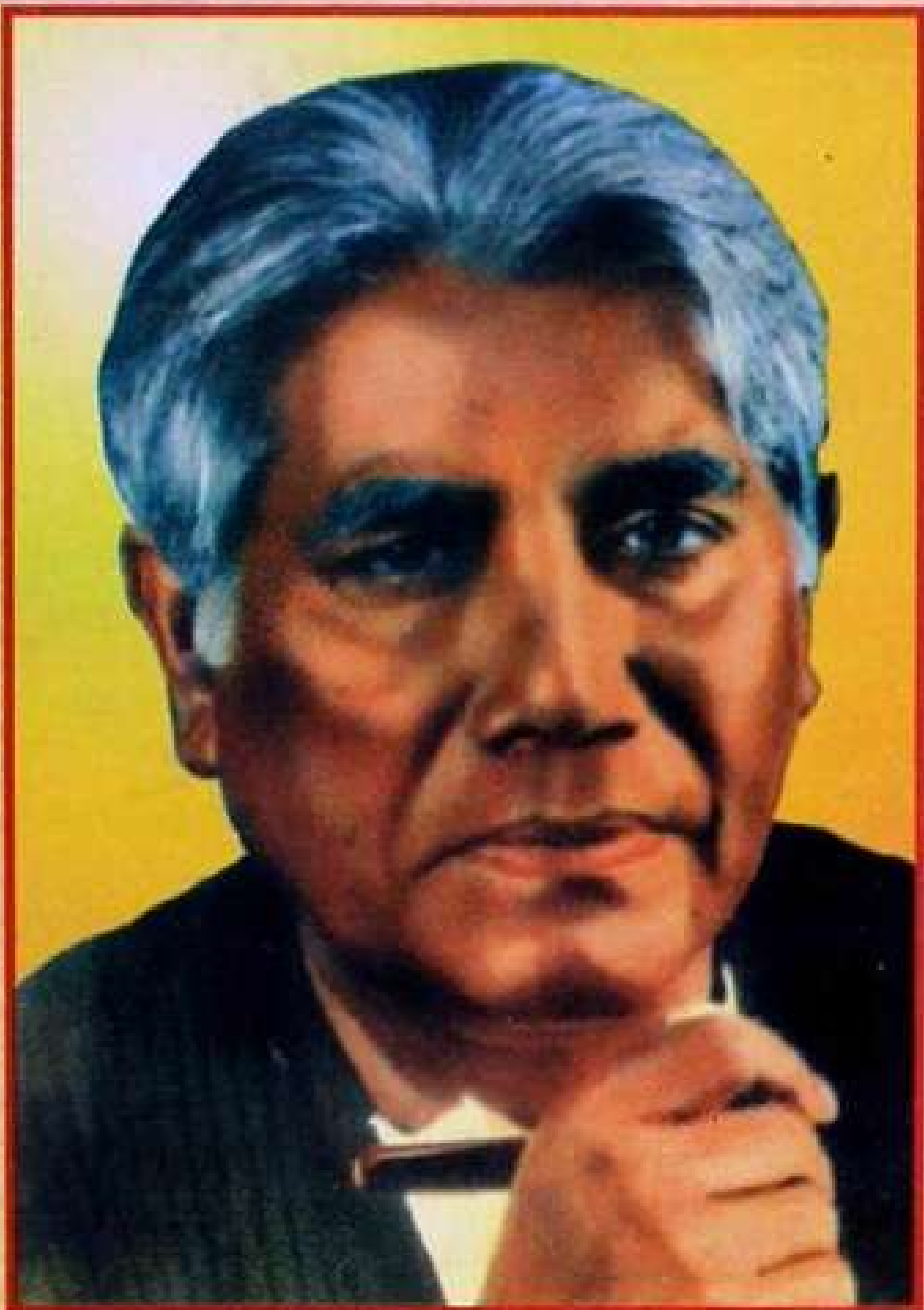
"پھینک دیں۔ چیز لکھی، اچھی نہیں لگی۔ پھاڑ دی۔ چھپی ہی نہیں۔ گرداب جب چھپی ہے میرے پاس ڈیڑھ سو نظمیں تھیں۔ ان میں سے کتاب میں صرف تیئیس ہیں۔ لکھ چھوڑتا ہوں۔ بعد میں دیکھتا ہوں ، پسند نہیں آتی تو پھینک دیتا ہوں یا ردوبدل کرتا ہوں۔ مثلاً "ایک لڑکا" کوئی اٹھارہ بیس سال میں پوری ہوئی ۔ کب میرے ذہن میں اس کا خیال آیا۔ کب پیٹرن بنا۔ کب آہنگ بنا۔ ان سب باتوں میں وقت لگا۔ اگر ایسی نظم جو اٹھارہ سال میں پوری ہوئی ہو، اسے کوئی شخص پڑھتے ہی

اپنی رائے کا اظہار کردے تو میں کیا سمجھوں گا کہ وہ شاعری سمجھتا ہے؟ وہ جو تم کہہ رہے تھے کہ آپ اپنے پڑھنے والوں سے مطمئن نہیں نظر آتے تو وہ اس لیے کہتا ہوں کہ جس نظم کے لکھنے میں اتنی محنت کی، مجھے اتنا وقت لگا اسے رواداری میں مت پڑھیے۔"

اخترالایمان کے آخری مجموعے کے نام کے بارے میں کچھ ایسے دوستوں سے مشورہ کیا جو اردو ادب میں بھی دخل رکھتے ہیں اور اخترالایمان سے ذاتی طور پر بھی واقف ہیں۔ کچھ کو "زمستاں سرد مہری کا" پسند آیا اور کچھ کو نہیں۔ سلطانہ ایمان اور مجھے خاص طور سے اس لیے مناسب لگا کہ اس میں اس سرد مہری کا اشارہ بھی آ جاتا ہے، جس کا شکوہ اخترالایمان کو اپنے پڑھنے والوں اور نقادوں سے ساری عمر رہا۔ یہ فیصلہ تو وقت کرے گا کہ ان کا شکوہ بجا تھا یا بے جا۔

بیدار بخت

۱۷ ستمبر ۱۹۹۶



ارضِ سبز و سیہ ، ابیض و سُرخ سے
میں گزرتا ہوا جاؤں گا، کوئی ہے؟
کوئی ہے ہم سفر میرا ، کوئی نہیں
اس مُسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی
جو تمھارا تھا ، میں نے تمھیں دے دیا
اور جو جس کا ہو مجھ سے لے لے ابھی
کل نہ کہنا مری بات میں کھوٹ تھا
کل نہ کہنا مری ذات آلودہ تھی

اخترالایمان

پیدائش : ۱۲ نومبر ۱۹۱۵

وفات : ۹ مارچ ۱۹۹۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6
PH:-3216162,3214465. FAX: 011-3265278

